کاک ٹیل

کرشن چندر

کاک ٹیل

مصنف :- کرشن چندر

ناشر
ممتاز پبلشرز۔ اردو بازار کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول : .... سنہ ۱۹۸۰ء

ناشر :- .... عبدالرحمٰن

قیمت :- .... [redacted] روپے

تعداد :- .... ایک ہزار

پریس :- .... اوکھائی پرنٹنگ پریس

ترتیب

	صفحہ نمبر
دانی	۳
مرزا کپتی	۳۰
مکھی کے دانے	۴۴
کوکھ کی کونپل	۶۲
کاک ٹیل	۷۵
کچرا بابا	۸۷
قیدی	۱۰۶
دسواں پل	۱۳۲

دانی

دانی لمبا اور بدصورت تھا۔ اس کی ٹانگوں اور بانہوں پر بال کثرت سے تھے اور بے حد کھردرے تھے۔ صبح سویرے چارک روڈ کے ہائیڈرینٹ پر نہاتے ہوتے وہ دور سے دیکھنے والوں کو بالکل بھینس کا ایک بچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم میں واقعی ایک بیل کی سی طاقت تھی۔ اس کا سر بڑا۔ ماتھا چوڑا اور کھوپڑی بڑی مضبوط تھی۔ دن بھر وہ چارک روڈ کے ناکے پر ایرانی ریستوران میں بڑی مستعدی سے کام کرتا اور رات کو ٹھرا پی کر ایک مینڈھے کی طرح سر نیچا کرکے ہر کس و ناکس سے کہتا۔ "آؤ میرے ساتھ ٹکر مارو۔" مگر بار لوگ ہنس کر طرح دے جاتے تھے کیونکہ دانی کا سر ہی نہیں اس کا جسم بھی بے حد مضبوط تھا۔ دو تین بار بھوگالین اور ڈوراگلی کے چند کسرتی نوجوانوں نے اس کا چیلنج منظور کرتے ہوتے اسے ٹکر پر گھیرا تھا اور نتیجے میں اپنا سر پکڑ کر چلے گئے تھے پھر کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ دانی کے سر سے ٹکر لے سکے۔

غالباً دانی کے سر میں ہڈی کے سوا کچھ ... نہ تھا۔ اگر مغز کا گودا ہوتا تو وہ بآسانی تھوڑی سی عقل صرف کر کے بمبئی کا دادا بن سکتا تھا اس سے

کم ڈیل ڈول اور طاقت والے نوجوان اپنے اپنے علاقوں کے ذی اثر دادا بن چکے تھے۔ اور غنڈوں کی پلٹنوں پر حکومت کرتے تھے۔ شراب اسمگل کرتے تھے۔ سٹہ کھلاتے تھے۔ سینما کے ٹکٹ بلیک بیچتے تھے۔ رنڈیوں کے کوٹھے چلاتے تھے۔ اور الیکشن کے موقع پر اپنے اپنے علاقے کے ووٹ بیچتے تھے۔

مگر شاید دانی کی کھوپڑی میں بھیجہ نہ تھا۔ کیونکہ اس کو اس قسم کے تمام کاموں سے الجھن سی ہوتی تھی۔ جب کوئی اسے اس قسم کا مشورہ دیتا تو اس کے چہرے پر شدید بیزاری کے اثرات نمایاں ہو جاتے، اور وہ کہنے والے کی طرف اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی کر کے ہونٹ بھینچ کے سر جھکا کے کندھے پکڑ کے ایک حملہ کرنے والے مینڈھے کی طرح خطرناک پوز لے کر کہتا۔

پھر ایسا بولا تو ٹکر ماردوں گا۔"

اور مشورہ دینے والا کھسیا کر یا ہنس کر پرے ہٹ جاتا۔

دانی کو پڑھنے سے نفرت تھی۔ وہ تعلیم یافتہ آدمیوں کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ دانی کو شہرت سے نفرت تھی۔ جب کبھی کسی بڑے اور مشہور آدمی کا جلوس چارک چوک سے گزرتا اور اس عظیم الشان ہستی کو پھولوں میں لدے ہوئے ایک کھلی کار میں بیٹھے ہوئے دور دور سے ہجوم کی سلامیں لیتا ہوا دیکھتا تو کہتا۔

واہ۔ کیا سجا ہوا مینڈھا ہے۔ اس سے پوچھو میرے ساتھ ٹکرے گا۔"

واقعی ذرا غور کرو۔ تو صرف جنگِ آزادی کے دنوں میں دبلے پتلے لیڈر آتے تھے۔ آج کل جوں جوں عوام کی حالت پتلی ہو جاتی ہے۔ لیڈر موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اس قدر لحیم شحیم اور موٹے تازے دستیاب ہوتے ہیں۔ آج کل کہ ان پر بہ آسانی کسی منیڈھے یا ناگوری بیل کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

دانی کو سیاست سے کبھی سخت نفرت تھی۔ اونچی سیاست تو خیر اس کے پلے ہی نہ پڑتی تھی۔ لیکن وہ جو ایک سیاست ہوتی ہے، گلی محلے اور بازار و رستوران کی۔ وہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بس اُسے صرف کام کرنا پسند تھا۔ حالانکہ دانی مسلسل گھنٹے کام کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر رستوراں کا مالک بھی کیا کرے۔ وہ قانون کے ہاتھوں میں مجبور تھا۔ اور دانی اپنی فطرت کے ہاتھوں۔ اس لئے وہ صبح سویرے سب سے پہلے رستوراں میں آتا اور سب نوکروں کے بعد جاتا۔ اور دن بھر کھڑے کھڑے وہ کرانتہائی چوکسائی سے سب کام سب سے پہلے کرتا اور جب رستوران بند ہو جاتا اور دن بھر کی مشقت سے بھی دانی کا جسم نہ تھکتا تو وہ انتہائی بیزار ہو کر کھڑا پی لیتا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر اپنے دوستوں سے ٹکریں لڑا کر کوکتا اور جب کوئی تیار نہ ہوتا تو وہ مایوس ہو کر اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیتا اور فٹ پاتھ پر گر کر سو جاتا۔ بس یہی اس کی زندگی تھی۔

کم و بیش یہی اس کے دوسرے ساتھیوں کی زندگی تھی، جو اس کے

ساتھ رستوران میں کام کرتے تھے۔ اور اسی فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ جو چارک چوک کے رستوران کے بالکل سامنے سڑک پار کر کے چارک چرچ کے سامنے واقع ہے چارک چرچ کے چھوٹے سے میدان میں ایک طرف نیلے پتھروں کا بنا ہوا ایک خوبصورت سووہ ٹو ہے جس میں مقدس ماں کا بت ہے ایک طرف گل مہر کے دو پیڑ ہیں جنکا سایہ دن میں فٹ پاتھ کے اس کے حصے کو ٹھنڈا رکھتا ہے ان پیڑوں کی چھاؤں میں غریب عیسائی موم بتیاں، شمعیں۔ یسوع مسیح اور مریم کے موم کے بت اور گیندے کے ہار بیچتے نظر آتے ہیں۔ بھکاری دن میں بھیک مانگتے ہیں اور رات کو کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر سڑک کے کنارے چھجے ہوتے بس اسٹاپ ہیں جہاں بس کا کیو لگانے والوں کے علاوہ آس پاس کے نوجوانوں کا بھی مجمع رہتا ہے۔ کیونکہ یہ بس اسٹاپ مسافروں کے ڈبنگ روم ہی نہیں۔ عاشقوں کے ملاقات گھر بھی ہے۔ پانچ بجے ڈی اسی اسٹاپ پر مل جانا روزی گمرچا سے نکلتے ہوئے دوز دیدہ نگاہوں سے اپنے عاشق وکٹر کو دیکھتی ہوئی آہستہ سے کہتی ہے، اور پھر اپنی خوفناک اماں کے ساتھ گھبرا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر وکٹر پانچ یا چار بس دھڑکتے ہوئے دل، اور بے چین نگاہوں سے کبھی گھڑی دیکھتا ہوا کبھی اپنی پیٹی کستا ہوا روزی کا انتظار کرتا ہے ساڑھے چار بجے ہی سے وہ دیکھتا ہے۔ کہ جوزف اپنی ڈیزی کو لے کر گیا ہے۔ اور ٹام اپنی ازابیل کو لے کر بھاگا۔ اور شیلا تو جا سنگھ کے ساتھ چلی گئی۔ اس سالی شیلا کو کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ بلدی شنٹ اور یہ لارا بھی گئی۔ اس یہودی چھوکرے

کے ساتھ جسکا جانے کیا نام ہے۔ لیکن جو ہر روز پانچ بجے اپنی موٹر سائیکل
یہیں کھڑی کرتا ہے۔ اب ساڑھے پانچ ہو گئے۔ اب پونے چھ ہو گئے۔ اب
اگر روزی نہیں آئی تو وہ لوگ گن آف نیوراں نہیں دیکھ سکتے اور اس کے
دونوں ٹکٹ بے کار ہو جائیں گے۔ اب وہ اکیلا گن آف نیوراں دیکھ کر کیا
کریگا۔ سن آف اے گن۔ چھ بج گئے۔ روزی نہیں آئی۔ وہ واپس نہیں آئے گی
شاید وہ فرانسس کے ساتھ چلی گئی جس کے ساتھ اس کی ماں۔ اس کی
شادی کرنا چاہتی ہے۔ بلڈی سوائین وہ فرانسس کو گولی مار دے گا۔ روزی
کو بھی گولی مار دے گا۔ اور پھر خود اس کی نحوس ماں کو جو ہر وقت سائے کی
طرح روزی کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ وہ برگائین فیملی کے ہر فرد کو گولی
مار دیگا اور پھر خود بھی گولی مار کر مر جائے گا۔ یکایک وکٹر نے دور سے روزی
کو ہلکے لیمن رنگ کے تافیتا فراک میں پھول کی ایک شاخ کی طرح جھولتے
دیکھا۔

اس کے دل سے گولی مارنے کا خیال ایک دم نکل گیا اور اسکا دل
مسرت سے کھل اٹھا اور وہ بے اختیار روزی کی طرف بھاگا اور بھاگتے
بھاگتے ایک دوڑتی ہوئی لاری کے نیچے آنے سے بال بال بچ گیا۔ روزی
کے منہ سے ایک خوف کی چیخ نکلی۔ مگر دوسرے لمحہ میں وکٹر کا ہاتھ اس کی
کمر میں تھا۔ اور وہ اسے دوڑاتے ہوئے لاریوں گاڑیوں ٹیکسیوں کی بھیڑ
سے نکالتے ہوئے ڈی بس کے اسٹاپ پر لے گیا۔ بس چل چکی تھی۔ مگر دونوں

نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ پہلے وکٹر نے پکڑا۔ پھر اس نے ہاتھ سے زور سے جھٹکا دیکر روزی کو اوپر کھینچ لیا۔ چند لمحوں کے لئے روزی کا لیمن رنگ فراک کا گول گھیرا تماشائیوں کی نظروں میں گھوما۔ پھر وہ دونوں پھولی ہوئی سانسوں میں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو بازو سے پکڑے ہوئے ڈبل بس کی اوپری منزل میں چلے گئے۔ جہاں سے آسمان نظر آتا ہے اور ہوا تازہ ہوتی ہے، اور نیچے سڑک پر مرد عورتیں، بجے سنگیت کے سُروں کی طرح بکھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کون کہتا ہے۔ محبت کرنے کے لئے پہلگام، نینی تال یا دارجلنگ جانا ضروری ہے۔ محبت کرنے والے تو کسی بس اسٹاپ پر کھڑے ہوکر بھی اپنی جان پر کھیل کر محبت کر جاتے ہیں۔

مگر دانی کو عورتوں سے کبھی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے جس رات اس نے ثریا کو غنڈوں کے ہاتھوں سے بچایا۔ اُس کے دل میں ثریا سے یا کسی عورت سے بھی محبت کرنے کا کوئی خیال تک پیدا نہ ہوا تھا۔ پیچھے مڑکر دور دور تک جب وہ نظر ڈالتا تو اُسے اپنی زندگی میں کوئی عورت دکھائی نہ دیتی۔ بہت دور بچپن میں اسے ایک زرد اور مایوس چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ جس نے اُسے ایک جھونپڑے سے باہر نکال کر اس کے چچا کے حوالے کر دیا تھا اس سے زیادہ اس کے دل میں اپنی ماں کی کوئی یاد نہ تھی۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خوفناک چچی کی صورت تھی۔ پھر اجو متواتر چار برس تک اُسے پیٹتی رہی تھی۔ ذرا بڑا ہونے پر وہ فوراً ہی اپنی چچی کے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا

اور جب سے وہ آزاد تھا۔ مگر وہ ہمیشہ وہ اپنی بھوک کے ہاتھوں عاجز رہا۔ اسے بہت بھوک لگتی تھی۔ اس وجہ سے اس کی ماں نے اسے اس کے چچا کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ وہ قانون سے اپنے بیٹے کا پیٹ نہیں بھر سکتی تھی۔ اور آج دانی کہہ سکتا تھا۔ اس کی چچی کوئی مہربان عورت نہ تھی۔ ہرگز کوئی ظالم عورت نہ تھی۔ مگر اس کے اپنے پانچ بچے تھے۔ اور دانی کی بھوک اتنی وسیع و عریض بھاری اور مضبوط بلند اور دیوزاد تھی۔ کہ چچی نے اس کے بار بار کھانا مانگنے پر مجبور ہو کر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ دانی کو نہیں پیٹتی تھی، وہ اس کی بھوک کو پیٹتی تھی۔ اور آج بھی کتنی بیویاں اور شوہر مائیں اور بیٹے اور بہوئیں۔ اور نندیں اور بھاوجیں اور چچیرے بھائی اور خلیرے بھائی دوست اور یار اور دل کے پیارے اور جگر کے ٹکڑے ہیں جو اس بھوک کی خاطر ایک دوسرے کو پیٹتے ہیں۔ بے وفائی کرتے ہیں۔ دھوکہ دیتے ہیں جان لیتے ہیں، پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔ مگر کوئی اس ظالم دیوزاد خوفناک بھوک کو پھانسی نہیں دیتا جس کے منحوس وجود سے اس دنیا کا کوئی انسانی رشتہ اور کوئی تہذیب قائم نہیں ہے۔

دانی یہاں تک تو نہ سوچ سکتا تھا۔ وہ جب بھی سوچنے کی کوشش کرتا تھا اس کے ذہن میں ایک بڑی خوفناک بھوک کا خیال آتا تھا جس کی وجہ سے اس کی ماں نے تنگ آ کے اسے اس کے چچا کے حوالے کر دیا۔ جس کی وجہ سے اس کی چچی اسے دن رات چار سال تک مارتی پیٹتی رہی۔ اور جس کی وجہ سے وہ آگے جا کر اپنی زندگی میں بار بار مختلف ہاتھوں سے

پڑا اور مختلف گھروں سے نکالا گیا اس لئے اس کے ذہن میں عورت کی محبت باپ کی شفقت، دوست کی رفاقت، کسی کا کوئی احساس نہ تھا۔ ایک مسلسل... ناآسودہ بھوک کا احساس تھا جو بچپن سے جوانی تک اس کے ساتھ چلا آیا۔ چونکہ اسکا بدن دوسروں سے دگنا۔ اور بڑا تھا، اس لئے وہ دوسروں کے مقابلے میں دگنی خوراک کا طالب تھا۔ دانی کو زندگی بھر ایک ہی ارمان رہا۔ کوئی اسے پیٹ بھر کے کھانا دے دے اور پھر چاہے اس سے چوبیس گھنٹے مشقت کرائے۔ مگر دانی کا یہ خواب چارک روڈ کے ایرانی رستوران ہی میں آکے پورا ہوا۔ ایرانی رستوران کا مالک اس سے چار آدمیوں کی برابر مشقت کراتا تھا۔ مگر پیٹ بھر کر کھانا دیتا تھا۔ اور بیس روپے تنخواہ دیتا تھا۔ جس سے دانی کھڑا پیتا تھا۔ اور پیٹ بھر کے کھانا کھاکے اور کھڑا... پی کر... فٹ پاتھ پر سو جاتا تھا۔ اور اسے دولت اور سیاست اور شہرت اور عورت وغیرہ وغیرہ کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ اب وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تھا۔

جس رات ثریا کو اس نے غنڈوں کے ہاتھوں سے بچایا اس دن بھی اس کے دوست علی اکبر نے اسے بہت منع کیا تھا۔ تین چار غنڈے مل کر ثریا کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے جو چرچ کے آہنی جنگلے سے باہر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی تھی۔ چوک کا سپاہی ایسے موقع پر گشت لگانے چلا گیا تھا۔ جیسا کہ ایسے موقعے پر اکثر ہوتا ہے۔ ثریا خوف اور دہشت سے چلا رہی تھی۔ اور علی اکبر نے دانی کو بہت سمجھایا تھا۔

یہ بمبئی ہے ایسے موقعوں پر یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ ایسے موقعے پر سب لوگ کان لپیٹ کر سو جاتے ہیں۔ تم بھی سو جاؤ۔ حماقت مت کرو۔ مگر دانی اپنے کانوں میں انگلیاں دینے کے باوجود ثریا کی چیخوں کی تاب نہ لاسکا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیکسی کی جانب بھاگا۔ غنڈوں کے قریب جاکے اس نے ان سے کوئی بات چیت نہ کی اس نے سر نیچا کر کے ایک غنڈے کے سر میں ٹکر ماری۔ پھر دوسرے کے۔ پھر پلٹ کے تیسرے کے۔ اگلے چند لمحوں میں تینوں غنڈے فرش پر پڑے تھے۔ اوران کے سر پھٹ گئے تھے۔ پھر پلٹ کر دانی نے جو چوتھے غنڈے کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے ثریا کو فٹ پاتھ پر چھوڑ کر ٹیکسی کے اندر کود گیا اور ٹیکسی والا گاڑی اسٹارٹ کرکے یہ جا وہ جا۔ دانی مینڈھے کی طرح سر نیچا کر کے ٹیکسی کے پیچھے بھاگا۔ مگر موٹر کا مینڈھا بہت تیز رفتار ہوتا ہے۔ اس لئے دانی مایوس ہو کر پلٹ آیا اور واپس آکر ثریا سے پوچھنے لگا۔

"یہ کون لوگ تھے۔؟"

"ایک تو میرا بھائی تھا۔" ثریا نے سسکتے سسکتے کہا۔

"تمہارا بھائی تھا۔؟" دانی نے پوچھا۔

"ہاں۔" ثریا نے سر ہلا کر کہا۔ "وہ مجھے ان غنڈوں کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا۔"

"کتنے روپیوں میں!"

"تین سو روپیوں۔" ثریا نے جواب دیا۔

"پھر ؟"

"پھر میں نہیں مانی ۔" ثریا بولی ۔

"تم کیوں نہیں مانی ۔"

"میں چھ سو مانگتی ہوں ۔"

"تم چھ سو مانگتی تھی ۔؟" دانی نے حیرت سے پوچھا ۔

"وہ کیوں ۔؟"

"وہ میرا بھائی تین سو روپے جاتا تو مجھے کیا ملتا ۔ میں جو بک رہی تھی تو مجھے بھی کچھ ملنا چاہیئے تھا ۔" ثریا نے دانی کو سمجھایا ۔

دانی خفا ہو کے بولا ۔ "واہ ۔ جو چیز بیچی جاتی ہے اسے کیا ملتا ہے ! ایسا دستور تو ہم نے زندگی میں کہیں نہیں دیکھا نہ سنا ۔ ہماری دکان سے جو گاہک چار آنے کا کھارا بسکٹ خریدتا ہے اسے چار آنے کے عوض کھارا بسکٹ ملتا ہے ۔ دوکاندار کو چار آنہ ملتا ہے ۔ مگر کھارا بسکٹ کو کیا ملتا ہے !" ایں ۔؟"

"میں کھارا بسکٹ نہیں ہوں ۔" ثریا غصے سے بولی ۔

دانی نے سر سے پاؤں تک ثریا کو دیکھا ۔ جوان تیز اتیکھی نکیلی اور سانولی ۔ وہ بولا ۔

مگر بالکل کھارا بسکٹ کی طرح لگتی ہو ۔"

ثریا مسکرائی ۔ کچھ شرمائی ۔ اگر وہ ساڑھی پہنے ہوتی تو ضرور اس وقت اسکا پلو اپنے سینے پر لے لیا ہوتا کہ ایسے موقعوں پر عورتوں کی یہ

ایک پیٹینٹ ادا ہوتی ہے۔ مگر اس بے چاری نے تو سیاہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس لئے اس نے صرف گردن جھکانے پر اکتفا کی۔

دانی پلیٹ کر فٹ پاتھ پر اپنی جگہ پر آ گیا اور بولا۔

"اچھا اب جاؤ کہیں دفع ہو جاؤ۔"

ثریا اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

ایرانی کا ریستوران تو بند ہو چکا تھا۔ اس لئے دانی اس کے لئے دوڑا گلی کے ایک چائے خانے سے۔ چائے۔ سلائس اور آملٹ ادھار پر لایا۔ اور جس طرح سے ثریا نے اسے کھایا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بھوک میں بھی دانی کا سٹائل جھلکتا ہے۔ دو لقموں میں وہ چار سلائس کھا گئی ایک لقمے میں آملیٹ۔ پھر اس نے ایک ہی گھونٹ میں ساری چائے اپنے حلق سے نیچے اتار دی۔ دانی اس کی اس حرکت پر بیحد خوش ہوا۔ یکایک اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے ایک جگری دوست مل گیا ہو۔ بولا۔

"تمہیں بھوک بہت لگتی ہے؟"

"بہت۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" دانی نے اب پہلی بار اس سے اس کا نام پوچھا۔

"ثریا۔ یعنی۔ سوسنا۔!" ثریا جھجکتے جھجکتے بولی۔

"میں دانی ہوں۔" دانی نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

"ڈنٹیل!"

پھر وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور یکایک پہلی بار انھیں آسمان بہت صاف دکھائی دیا اور دولتمند رسے نغمے کی صدا آنے لگی اور میٹھی گداز رات گل مہر کے پھول پہنے ان کے ترسے ہوئے جسموں کے قریب سے گزرتی گئی۔

روزرات کو فٹ پاتھ پر دانی ثریا کا جھگڑا ہوتا تھا۔ کیونکہ دانی نے ثریا کو ایرانی رستوران کے کچن میں نوکر کروا دیا تھا۔ پہلے تو اس نے کئی دن تک ثریا کو فٹ پاتھ سے بھگانے کی کوشش کی۔ وہ منیڈھے کی طرح سر جھکا کے جب ثریا کی جانب رخ کرتا تو ثریا وہاں سے بھاگ جاتی اور دانی کے سو جانے کے بعد واپس اسی فٹ پاتھ پر چلی آتی اور ہولے سے اس کے پاؤں دابنے لگتی اور جب صبح سویرے دانی اٹھتا تو اسے اپنا بدن بہت ہلکا عمدہ اور مضبوط معلوم ہوتا۔ اور وہ دیکھتا کسی نے اس کی بنیان دھو دی ہے اور قمیض اور پتلون بھی تو پہلی بار اسے زندگی میں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنے گھر میں آگیا ہو۔ پہلی بار اس نے ثریا کو انگلیوں کو ایک عجیب انوکھے انداز میں دیکھا۔ وہ دیر تک اس کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر راتوں کو اسے فٹ پاتھ پر اپنا بستر اور تکیہ لگا ہوا ملنے لگا۔ اور وہ جگہ بھی صاف ستھری اور مسلسل جھاڑ پونچھ سے چمکتی محسوس ہونے لگی۔ جہاں وہ ہر روز سوتا تھا۔ وہ ثریا کے وجود کا عادی ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی ہر روز کھانے کے وقت

رات کو فٹ پاتھ پر دونوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ کیونکہ ثریا بھی بہت کھاتی تھی۔ اور دانی بھی۔ دونوں بھی رات کا کھانا رستوران سے لے آتے تھے۔ اور مل کر کھاتے تھے۔ اور دونوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کون کس سے زیادہ کھاتا ہے۔ اکثر اوقات۔ دانی کامیاب رہتا تھا۔ لیکن جس دن ثریا زیادہ کھانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس دن وہ دانی کے ہاتھوں ضرور پٹتی تھی۔

ایک دن ثریا نے دانی سے کہا۔

"اب تم مجھے مت پیٹا کرو۔"

"کیوں۔؟"

"کیوں کہ اب میرے بچہ ہونے والا ہے۔" ثریا نے اسے سمجھایا۔

دانی نے یکایک کھاتے کھاتے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ حیرت سے ثریا کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"بچہ۔؟"

"ہاں۔!" ثریا خوش ہو کر بولی۔

"وہ بھی کھائے گا!" دانی کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ خفیف سی مایوسی بھی تھی۔

"ہاں وہ بھی کھائے گا۔" ثریا نے اسے سمجھایا۔ "پہلے تو میں ایک تھی۔ اب دو ہوں ایک میں ہوں ایک میرا بچہ۔ تمہارا بچہ.... پیٹ میں اب ہم دونوں ہیں۔ ہم دونوں کو زیادہ روٹی ملنی چاہیئے۔"

دانی نے اپنے سامنے فرش پر پڑے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے پر کھانے کو دیکھا۔ پھر اس نے ثریا کو دیکھا۔ پھر اس نے اپنا منہ بڑی سختی سے بند کیا اور دونوں جبڑوں کو ہلا کر اس طرح کی جنبش کی جیسے وہ مایوسی کا ایک بہت بڑا لقمہ نگلنے جا رہا ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے کاغذ کا ٹکڑا ثریا کی جانب بڑھا کر کہا۔

"لو کھاؤ۔"

"نہیں تم بھی کھاؤ۔ تم نے کچھ کھایا ہی نہیں۔" ثریا نے کہا۔

"نہیں پہلے تم کھا لو۔ بعد میں جو بچے گا۔ وہ میں کھا لوں گا۔" دانی نے ایک عجیب ملائمیت سے کہا۔

پہلے دن تو ثریا سب چٹ کر گئی۔ اس زور کی بھوک لگی تھی اُسے دوسرے دن اس نے کچھ تھوڑا سا چھوڑا دانی کے لئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ دانی کے لئے زیادہ کھانا چھوڑنے لگی۔ پھر بھی جو باقی بچتا تھا۔ وہ دانی کے لئے اس قدر کم ہوتا تھا کہ وہ اس کی آدھی بھوک تشنہ ہی رہ جاتی تھی۔ لیکن اب اس نے خالی پیٹ یا آدھے پیٹ رات کو بھوکے سو جانا سیکھ لیا تھا۔ پرانی عادت کو واپس بلانا اس قدر مشکل نہیں ہوتا جس قدر نئی عادت کو پالنا۔ ہولے ہولے اس نے شراب پینا چھوڑ دیا۔ کیونکہ بچے کو خوراک چاہیئے اور کپڑے بھی اور ثریا نے ابھی سے اپنے لئے کپڑے سینے شروع کر دیئے تھے۔ چھوٹے سے منے سے گدڑے کے کپڑے رنگدار اور ملائم ریشمی، جن پر ہاتھ پھیرنے سے دانی کے جسم اور روح میں مسرت اور شادمانی کی پھریریاں سی گھومنے

لگی تھیں ہمیں زیادہ سے زیادہ بچانا چاہیئے۔ کئی دنوں کے سوچ بچار کے بعد دانی اس نتیجے پر پہنچا۔

رات کے بارہ بجے تھے۔ اور اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر ایک دوسرے کے قریب لیٹے تھے۔ اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں کوئی دن ایسا یاد نہیں آتا جب دن میں بھوکا نہیں رہا۔ دانی بولا۔

میں کوئی رات ایسی یاد نہیں کر سکتی جب میں کھانا چرانے کے الزام میں نہ پٹی ہوں۔" ثریا بولی۔

مگر ہمارا بچہ بھوکا نہیں رہے گا۔ دانی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس کے پاس سب کچھ ہوگا۔" ثریا نے پر امید لہجے میں کہا۔

پیٹ بھرنے کے لئے روٹی۔ تن ڈھکنے کے لئے کپڑا دانی نے خوابناک لہجے میں کہا۔

اور رہنے کیلئے گھر!" ثریا بولی۔

"گھر!" دانی نے چونک کر پوچھا۔

کیا اپنے بچے کو گھر نہ دو گے؟" ثریا نے شکایت کے لہجے میں پوچھا۔

کیا وہ اسی فٹ پاتھ پر رہے گا۔"

"مگر گھر کیسے مل سکتا ہے؟" دانی نے پوچھا۔

میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ ثریا نے سمجھایا۔ چرچ کے پیچھے نو امنیشن بن رہی ہے اس میں پانچ کمرے والے فلیٹ ہوں گے اور چار کمرے والے اور

تین کمرے والے اور دو کمرے والے اور دس فلیٹ ایک فلیٹ والے بھی ہوں گے۔ جنکا کرایہ سترہ روپے ہوگا۔ اور پگڑی سات سو روپے۔

مگر ہم سات سو روپے کہاں سے دیں گے؟" دانی نے پوچھا۔

اب تم کو سیٹھ تیس روپے دیتا ہے۔ مجھ کو پچیس روپے دیتا ہے۔ اگر ہم ہر مہینہ پچاس روپئے نورانیشن کے مالک کو دیں تو وہ چودہ مہینے میں ایک کمرے کا فلیٹ ہم کو مل سکتا ہے۔

بہت دیر تک دانی سوچتا رہا۔ ثریا کا ہاتھ دانی کے ہاتھ میں تھا۔ یکایک دانی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں ایک ننھے بچے کا ہاتھ بھی آگیا ہے۔ اسکا دل عجیب طریقے سے پگھلنے لگا۔ پگھلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آگئے اور اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں ثریا کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیں۔ اور رندھے ہوئے گلے سے بولا۔

ہاں۔ میرے بچے کا گھر ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ میں سوچتا ہوں۔ ثریا۔ میں تین گھنٹے کے لئے ڈور گلی کے چائے خانے میں رات کے گیارہ بجے سے دو بجے تک کام کروں۔ جب تو اپنا رستوراں بھی بند ہو جاتا ہے گیارہ بجے۔ پھر گیارہ بجے سے دو بجے تک چائے خانے میں کام کرنے میں کیا حرج ہے، وہ چائے خانے کا سیٹھ دس روپے پگار دینے کو بولتا ہے۔ مگر میرے خیال میں وہ بارہ پندرہ روپے تک دے دیگا۔

" جب تو ہم جلدی گھر لے سکیں گے۔ ثریا نے خوش ہو کر کہا۔

اور اگر ایرانی سیٹھ ادھار روپے دے دے تو شاید اپنے گھر پر

ہی بچہ پیدا ہو گا۔

دانی کا چہرہ خوش آئیند امید کی روشنی سے چمکنے لگا۔ یکایک اس نے ثریا کا ہاتھ زور سے دبا کر کہا۔" آؤ دعا کریں۔

وہ دونوں اٹھ کر گرجا کے آہنی جنگلے کو پکڑ کر دوزانو ہو گئے۔ جالی دار آہنی سلاخوں کے درمیان گرجا کے وسیع صحن کے وسط میں لیسوع مسیح کا بت صلیب پر آویزاں تھا۔ اور ایک طرف نیلے پتھروں کے گراٹو میں مریم نے مقدس بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اور گراٹو میں مومی شمعیں روشن تھیں اور گل مہر کی نازک پتیاں ہوا کے جھونکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چاروں طرف گر رہی تھیں اور مقدس مریم کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ جیسا بچہ ہر ماں کے تصور میں ہوتا ہے اور یہ رات مریم کے لبادے کی طرح ہری تھیں۔ اور کسی نیند میں ڈوبے ہوئے یسوع کے خواب کی طرح معصوم ۔۔۔

دعا پڑھ کر دانی نے ثریا سے پوچھا۔

" یہ پادری آج بار بار اپنے وعظ میں آزادی۔ روٹی اور کلچر کی بات کر رہا تھا۔ آزادی اور روٹی تو خیر سمجھ میں آتی ہیں۔ مگر یہ کلچر کیا ہے ؟"

" میرے خیال میں کوئی میٹھا کیک ہو گا۔" ثریا سوچ کر بولی۔

اور وہ دنیا میں امن کی بات بھی کرتا ہے۔! دانی بولا۔ مگر ہمیشہ تو میرے پیٹ میں ایسی جنگ ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ پیٹ کی جنگ کیسے بند ہو گی۔ اور خدا کیسی بھیانک جنگ ہوتی ہے میرے پیٹ میں۔۔۔"

اس جنگ کو میں بھی جانتی ہوں۔ میری ماں بھی جانتی تھی۔ میری بہنیں بھی میرے بھائی بھی اور ہم سب کا باپ بھی۔ ثریا یاد کرتے کرتے بولی۔ اور میرے باپ کا بھی۔۔۔۔ بے چارہ بڈھا۔۔۔ کوئی رشتہ ہم سے اس قدر قریب نہیں رہا۔ جس قدر بھوک کا۔۔۔"

بیٹ ہیں امن۔ اور دنیا میں امن۔ جیسا کہ وہ پادری کہتا تھا۔ آمین

ایک دن ثریا جس غیر متوقع طریقے سے آئی تھی۔ اسی طرح سے وہاں سے چلی گئی۔ خبر سنتے ہی دانی بھاگا رات کے ڈیڑھ بجے دوڑا گلی کے چائے خانے سے اپنے فٹ پاتھ پر تو اس نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک اژدہام ہے۔ اور پولیس کے بہت سے سپاہی سڑک پر اور فٹ پاتھ کے آس پاس کھڑے ہیں اور ایک ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھا ہوا ہے اور اسکا انجن گرجا کے آہنی جنگلے کو موڑتا ہوا گل مہر کے پیڑ سے ٹکرا گیا ہے۔ پچھلے پہیوں پر ثریا اور علی اکبر کی لاشیں رکھی ہیں۔ کیونکہ یہی دو لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ٹرک کی زد میں آئے تھے۔ اگر دانی بھی سویا ہوا ہوتا تو اس وقت اس کی لاش بھی یہیں پڑی ہوتی۔ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں تیزی سے گزرتے ہوئے یا ایک دوسرے سے ریس کرتے ہوئے ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے ہیں۔ بڑے

شہروں میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے معمولی بات ہے۔

دانی ایک احمق کی طرح خون میں لت پت ثریا کی لاش پر جھکا رہا۔ پھر پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھنے لگا اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"مگر ابھی تو وہ زندہ تھی۔"

دو گھنٹے پہلے اس نے اور میں نے اپنی جگہ پر کھانا کھایا تھا۔

وہ بالکل زندہ اور تندرست تھی۔

اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

اس کے پیٹ میں میرا بچہ تھا۔

چھ مہینے کا بچہ۔

میرا بچہ۔۔۔۔

کس نے مارا انہیں! یکایک دانی دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کستے ہوئے زور سے بھنچا۔

ایک تماشائی نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ فوراً پولیس کے دو سنتریوں نے دانی کو پکڑا۔ مگر دانی نے گھونسے مار کر دونوں سنتریوں سے اپنے آپ کو آزاد کرا دیا۔ اس عرصے میں دونوں سنتری اس سے کش مکش کرتے ہوئے اسے ٹرک سے دور گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ دانی اس سے آزاد ہو کر ٹرک کی جانب لپکا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ بدن جھک گیا۔ اور پھر ایک مینڈھے کی طرح تن گیا۔ اس کے ہونٹوں سے جانور نما ایک بھنچی ہوئی سی غراہٹ نکلی۔ وہ

اپنے سر کو ایک خوفناک طریقے سے آگے بڑھاتے اور جھکاتے تیزی سے ٹرک پر حملہ آور ہو گیا۔

پورے چھ ماہ وہ ہسپتال میں رہا۔ کیونکہ اس کا سر کھل گیا تھا۔ وہ بچ تو گیا تھا مگر اس کے دماغ کا ایک حصہ تقریباً بیکار ہو چکا تھا۔ اور اب اسکا سر ایک نیٹڈ ولم کی طرح چلتے ہوئے آپ ہی آپ ہلتا تھا۔ اور اسکا وحشی منیڈھے کی طرح پلا ہوا مضبوط جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح دبلا ہو گیا تھا۔ اور اسے بہت کچھ یاد نہ تھا۔ اور بہت کچھ بات کہ یہ تھا۔ اور اب وہ کام بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر گاہک اس سے چائے مانگتے۔ تو وہ اس کے سامنے پانی لاکر رکھ دیتا۔ اور اگر کوئی آملیٹ مانگتا تو وہ اس کے سامنے ماچس کی ڈبیہ رکھ دیتا۔ اس لئے ایرانی رستوراں کے مالک نے مجبور ہو کر اسے ملازمت سے الگ کر دیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک فٹ پاتھ پر اس جگہ سوتا تھا جہاں ثریا سوتی تھی اور اس نے اپنے بچے کے کپڑے گرجا کے آہنی جنگلے کے کسی کمرے میں چھپا کر رکھ دیئے تھے۔ اور رات کے سناٹے میں وہ اکثر انہیں نکال کر بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر تکا کرتا تھا۔ اور فٹ پاتھ پر حجامت کرنے والا راموتائی کٹرس سے پوچھتا۔

"یہ کس کے کپڑے ہیں۔

میرے بچے کے ہیں۔"

۲۱

"تیرا بچہ کہاں ہے۔"، گولین کے چائے خانے کا قاسم۔ اس سے پوچھتا ہے۔

"وہ میری ثریا کے پاس ہے۔"

"تیری ثریا کہاں ہے؟"

"وہ میکے گئی ہے۔"

وہاں سے کب لوٹے گی؟ گوپی جب کرنا اس سے پوچھتا۔

جب میرا گھر بن جائے گا۔" وہ انتہائی معصومیت سے جواب دیتا۔

یہ جواب سن کر مذاق کرنے والوں کے چہرے فق ہو جاتے۔ اور وہ بیٹھے بیٹھے خلاؤں میں تکنے لگتے۔ جیسے دور سے کسی ٹرک کو اپنی طرف دیکھ رہے ہوں اور ہل نہ سکتے ہوں۔ فٹ پاتھ پر رہنے والے اپنی مجبوری سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فٹ پاتھ سے ہم اپنا بستر تو تہہ کر سکتے ہیں لیکن فٹ پاتھ کو تہہ نہیں کر سکتے ابھی تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے اس لئے انھیں دانی کے گھر کا تخیل ایک بہت بڑا مذاق معلوم ہوا۔

دوسرے دن دانی بڑے انہماک سے اپنا گھر بنانے میں مصروف نظر آیا۔ کہیں سے وہ تین اینٹیں اٹھا لایا تھا۔ اور اب وہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر تیسری اینٹ لگانے میں مصروف تھا۔ کہ قاسم نے اس سے اس سے پوچھا۔

"دانی یہ کتنا بڑا گھر ہوگا۔؟"

دانی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"یہ ایک بہت بڑا گھر ہوگا۔ وہ بولا۔ اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اسے چارک روڈ کے عین بیچ میں تعمیر کر دوں گا۔ اس کے دس مالے ہوں گے۔ ہر مالے میں بیس فلیٹ ہوں گے۔ ہر فلیٹ میں تین کمرے ہوں گے۔"

"تین کمرے کس کے لئے۔؟" گوپی جیب کترے نے پوچھا۔

ایک میاں کے لئے۔ ایک بیوی کے لئے۔ ایک بچے کے لئے۔"

"مجھے بھی اس گھر میں جگہ دو گے؟" رام حجام نے پوچھا۔ میری بیوی ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ اور وہ تینوں میرے گاؤں میں ہیں۔ کیونکہ یہاں میرے پاس کوئی گھر نہیں ہے اور میری ماں بوڑھی ہے۔"

گوپی بولا۔" اور میرے پاس کوئی کام نہیں ہے سوائے جیب کاٹنے کے۔ اور میں تین دفعہ جیل کاٹ چکا ہوں۔ اور۔ مجھے تم اپنے گھر چوکیدار رکھ لینا اور رہنے کے لئے صرف ایک کمرہ دے دینا۔

"یہ ایک بہت بڑا گھر ہوگا۔" دانی انتہائی خلوص سے بولا۔ اور شدت جذبات سے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں باہر نکلی پڑی تھیں۔ اور اس میں تم سب کے لئے جگہ ہوگی۔ قاسم کے لئے۔ اور راموکے لئے۔ اور گوپی کے لئے۔ اور دھیراج کے لئے۔ اور دالبتے کے لئے اور پاملی کے لئے۔ اور ٹکا جاری کے لئے۔ اور ننھا گولین اور ڈورا گلی کے فٹ پاتھ پر سونے والوں

کے لئے بھی جگہ ہو گی میرا خیال ہے۔ میں اسے بلیس مالے کا بناؤں گا۔ ہر مالے میں بیس تیس فلیٹ ہوں گے۔ ہر فلیٹ میں چار کمرے ہوں گے ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم ہو گا فلش اور شاور ... ‘‘

موزیک کا فرش‘‘ قاسم بولا۔

اور کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہوئی‘‘، گوپی نے لقمہ دیا۔

یکایک ایک لمحہ کے لئے ان سب نے باور کر لیا۔ یقین کر لیا۔ ایک لمحے کے لئے انہوں نے چارک روڈ کے چوک پر اس بڑے گھر کو تعمیر ہوتے ہوئے بلند ہوتے ہوئے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ دوسرے لمحے میں ایک بہت بڑا ٹرک کھڑ کھڑ کرتا ہوا ان کے قریب سے گذر گیا اور وہ سہم کر چپ ہو گئے۔

اس کے بعد کئی ماہ تک دانی وہ گھر بناتا رہا۔ اینٹیں تو اس کے پاس وہی تین تھیں۔ مگر گھر کا نقشہ ہر روز بدلتا تھا۔ وہ اب پچاس منزل کا ایک محل تھا۔ جس میں صرف ایک فٹ پاتھ پر رہنے والے داخل ہو سکتے تھے۔ اس محل میں زندگی کی ہر سہولت اور آسائش مہیا تھی۔ بجلی کی لفٹ اور ٹیلی فون۔ ایک چھوٹا سا سینما اور نرسری سکول اور چھت پر خوبصورت پھولوں والا گارڈن۔ دیوار گیر روشنیاں اور مدہم مدہم رنگوں والے غالیچے اور خوبصورت تتلیوں کی طرح آہستہ خرام عورتیں اور بچے۔ اور دھیمے دھیمے بجتے ہوئے ارغنوں اور مہذب مرد مسکراتے

ہوئے سگریٹ پیتے ہوئے ایک دوسرے سے جام ٹکراتے ہوئے۔ اور ان کے کپڑے بھی عمدہ اور خوشبودار۔ اور جیبیں سکوں سے بھری ہوئی۔ اور وہ سب کچھ جو غریب لوگ سینما میں دیکھتے ہیں۔ اور امیر اپنے گھر پر رکھتے ہیں۔ اور سب کچھ اس کے گھر میں موجود تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند۔ خوبصورت۔ درخشاں۔ عالی شان۔ وہ گھر اتنا ہی خوبصورت تھا۔ جتنا کسی بے گھر کا تخیل ہو سکتا ہے۔

اور پھر جب کئی ماہ کی کاوش کے بعد وہ گھر مکمل ہو گیا۔ تو رات کے گیارہ بجے سے ایک بجے تک دانی ٹین کا ایک ڈبہ پیٹتے ہوئے چارک روڈ کے دونوں فٹ پاتھ اور تھوگا لین کے فٹ اور ڈورسا گلی۔ بلکہ کراس بازار اور چارک پارک کے فٹ پاتھوں کو اس نئے گھر میں آنے کی دعوت دیتا پھرا۔ ظاہر ہے اُس کے پاس وہی تین اینٹیں تھیں۔ مگر اب اس نے ان تین اینٹوں کو چارک چوک کے ٹریفک آئی لینڈ کے اندر رکھ دیا تھا۔ اور اس طرح اپنا محل تعمیر کر لیا تھا۔ اور اب وہ سارے فٹ پاتھیوں کو اپنے بیوی بچوں سمیت گھر میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

ڈورا گلی کے پاٹل نے یہ رک کر کہا۔

لیکن میرے تو سات بچے ہیں اور ہم سب کے سب اس کھلے فٹ پاتھ پر بڑے آرام سے سوتے ہیں۔ تمہارے تین کمروں والے فلیٹ سے ہمارا کیا ہو گا۔؟

"میں تمہیں سات نمبر دن والا فلیٹ دوں گا۔ دانی نے ٹین بجاتے ہوئے چلا کر کہا۔

"کب آئیں ہم لوگ؟" پاٹل کی بیوی نے اپنی مسکراہٹ کو ساڑھی کے پلو میں چھپا کر اس سے پوچھا۔ اس کی ہنسی رکی نہیں پڑتی تھی۔

کل صبح جب ثریا بچے کو لے کر میکے سے آجائے گی۔ میں اپنے گھر کے دروازے سب لوگوں کے لئے کھول دوں گا۔ دروازے پر بینڈ ہو گا۔ زنگار رنگ کی جھنڈیاں ہوں گی۔ اور بندھن داریں اور میں پادری کو گھر کی مہورت کے لئے بلاؤں گا۔ اور وہ بائبل سنائیگا۔ اور گرجا کے گھنٹے بجیں گے۔ اور اس وقت تم سب لوگ میرے گھر میں داخل ہو گے۔

دانی کی کانپتی ہوئی آواز میں انتہائی خلوص تھا۔ اس کا دبلا چہرہ زرد زرد اور بخار زدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور بجھی تھیں اور متواتر چلانے سے اس کے ہونٹوں پر کف جما تھا اور اس کے سوکھے روکھے بالوں کی لٹوں میں فٹ پاتھ کی خاک چمک رہی تھی۔

دوسرے دن دانی بلو گراؤنڈ کے باہر مقدس مریم کے قدموں میں مردہ پایا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور نیلے آسمان میں کسی تاریک سپنے کو تک رہی تھیں۔ اس کے کپڑے پھٹے چیتھڑے اور تار تار تھے۔ اور اس کے سینے پر وہی تین اینٹیں رکھی تھیں اور اس نے مقدس مریم کے قدموں کے فرش پر اپنا سر مار مار کر توڑ دیا تھا۔

گرجا کھول دو۔
اور گھنٹے بجاؤ۔
دیکھو، یسوع مسیح جا رہا ہے۔
اپنے سینے پر انیطوں کی صلیب لئے ہوئے۔
اب جنت کے دروازے غریبوں کے لئے کھل گئے ہیں۔ کیونکہ ایک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہیں گزر سکتا۔ لیکن ایک امیر قانون کے ہرنا کے سے گزر سکتا ہے۔

اور اب اس دھرتی کے مالک غریب ہوں گے۔
اور غریبوں کے مالک امیر ہوں گے۔
دیکھو وہ یسوع جا رہا ہے۔
آؤ اُسے سنگسار کریں۔

۔ز۔

مرزا کپّو

میں کلب میں نووارد تھا۔ سوائے کنور مراتب علی اور ان کے حلقے کے چند دوستوں کے اور کسی سے آشنا نہ تھا۔ اور کنور مراتب علی کلب کے مختلف حلقوں میں بہت مقبول تھے اور ایک حلقے سے دوسرے حلقے میں گڈمڈ ہوتے رہتے تھے۔ مگر مجھے شکایت نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ میری دلجوئی بھی ہر طرح سے فرماتے رہتے تھے۔ اور ہر روز گھنٹے آدھے گھنٹے کے لئے شام کو میرے پاس آکر بیٹھتے تھے۔

کلب میں میری پسندیدہ جگہ کھلے لانچ کا ایک کونہ ہے۔ جہاں میں ایک کرسی اور ٹیبل گھسیٹ کر، اور بیر کا آرڈر دیکر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور جھیل میں تیرنے والی کشتیوں کو دلچسپی سے دیکھتا ہوں، کناروں پر بید مجنوں کے پیڑوں کے نیچے جھیل میں سیر کرانے کے لئے زنگارنگ کشتیاں بندھی ہیں۔ مرد خوشنما لباس پہنے، کپڑے لٹکاتے، ملاحوں سے کھاؤ تاؤ کرتے نظر آتے ہیں۔ عورتیں دلفریب لباس پہنے، بچے لٹکائے اور شاداب نظر آتی ہیں۔ اور جن عورتوں کے بچے نہیں ہوتے ہیں وہ اپنے

شوہروں کا ہاتھ اپنی کمر میں لٹکائے نظر آتی ہیں۔ ان عورتوں کو اپنے شوہر یا منگیتر کے ہاتھ کی کس قدر ضرورت محسوس ہوتی ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ جھیل کے کنارے پہنچکر ہر عورت ذرا سی جھجکتی ہے۔ رکتی ہے۔ لڑکھڑاتی ہے۔ اور سنبھل کر، اور مرد کے ہاتھ کا سہارا لے کر کشتی میں سوار ہوجاتی ہے۔ مگر سوار ہونے سے پہلے وہ ایک میلے تبسم سے ضرور اپنے مرد کی طرف دیکھتی ہے جیسے اس کے ہاتھ کے سہارے کیلئے اس کے لئے اسکا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ آدھے گھنٹے میں اب تک پچیس کشتیاں کنارے سے روانہ ہوچکی ہیں۔ اب تک ایک مرتبہ ایسا نہیں ہوا کہ مرد نے اپنا ہاتھ عورت کی کمر میں نہ ڈالا ہو۔ ہر جگہ ہاتھ اور کمر سیم اور خضاب کی طرح لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ ہل اسٹیشن پر آکر کس قدر خوش اور رومانی معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ دور نیچے تپتے ہوئے میدانوں میں اپنے اپنے گھروں میں نوحہ پید نغموں کی طرح لسوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ! میرے پاس تو کوئی عورت بھی نہیں ہے اس لئے میں بیر کے گلاس کی موٹی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہوں۔ آہ! اسکا ذائقہ کس قدر تلخ ہے، جیسے ہر موٹی کمر کا ہوتا ہے۔

جگیر پور کی مہارانی کارڈ روم سے نکل کر چلی آرہی ہیں۔ عمر بیتالیس برس کے قریب ہوگی۔ چھڑی سولہ برس کی لڑکی کی سی پہنتی ہیں کنور مراتب علی کے حلقے سے تعلق خاطر رکھتی ہیں۔ اسی لئے میرے قریب چند لمحوں کے لئے رک جاتی ہیں۔ رخساروں کا غازہ تمتما رہا ہے اور آنکھ میں آنسو ہیں۔

"اجو نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔" اور یہ ان کے شوہر کی طرف

ساڑہ ہے۔)

میں چپ رہتا ہوں۔!

"میں نے اسپیشل چولی سلوائی ہے۔" جگبیر پور کی رانی پوری کلب میں اپنی خطرناک صاف گوئی کے لئے مشہور ہیں۔" مگر کمبخت نے میری طرف دیکھ کے نہیں دیا۔!"

چولی نئی ہے، مگر آپ تو پرانی ہیں۔ ان کے لئے کسی نئے عاشق سے پوچھنا چاہیئے۔ میں مشورہ دیتا ہوں اور ذرا سا جھک کے طنزیہ مسکراہٹ سے تعظیم دیتا ہوں۔!

"کیا میں خوبصورت نہیں ہوں۔؟" وہ پوچھتی ہیں۔

"آپ تو لونڈر کے پھولوں کی طرح تازہ اور مہکتی نظر آرہی ہیں۔" میں کہتا ہوں۔

رانی جی خوش ہو جاتی ہیں اور مجھے خوش کرنے کے لئے میرے بئیر کے گلاس سے ایک گھونٹ پی کر رخصت ہو جاتی ہیں اور چلتے چلتے مجھے باسٹرڈ کے لقب سے نواز جاتی ہیں۔ میں رانی جی کو عقب سے دیکھتا رہتا ہوں۔ ان کے کولھے۔؟ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا رانی جی نے اپنی ساڑھی کے اندر دو کدو اسکار کھے ہیں۔ مجھے ان کے شوہر پر بڑا ترس آتا ہے۔ فیشن والوں کو بہت جلد کولھے کسنے کے لئے بھی ایک چولی ایجاد کرنی چاہیئے۔

گلاس ختم ہو گیا۔ جب تک بئیر کا دوسرا گلاس آتے میں باتیں کرنے

میں بیٹھے ہوتے ایک مرد کو دیکھتا ہوں۔ یہ مرد ہر روز اسی کونے میں آکے بیٹھتا ہے۔ بہت وجیہہ اور باوقار مرد معلوم ہوتا ہے۔ اکثر عورتوں سے آنکھ نہیں ملاتا۔ اگر ملانا پڑ جاتے تو فوراً انتہائی تمیز داری سے نظریں جھکا لیتا ہے یہ مرد کون ہے؟ تین چار دن سے میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ ایسی حیادار آنکھیں تو میں نے کلب کے کسی مرد کے چہرے پر نہیں دیکھیں۔ ورنہ یہاں مردوں کی نگاہیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ عورتوں کے جسم میں سیندھ لگاتی معلوم ہوتی ہیں۔ کس قدر مہذب انسان ہے۔ یہ کلب کے دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف، باریک، سیاہ داڑھی کی یا دامی رنگ کی خوشنما اچکن اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوتے، پاؤں میں سیاہ پمپ شو۔ سر کے سیاہ بالوں میں ایک سفید لٹ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بیوی بھی "قاعدے" کی معلوم ہوتی ہے اور دونوں بچیاں بھی۔ جو ان کے ساتھ آتی ہیں۔ مگر اس کے لواحقین غیر دلچسپ معلوم ہوتے ہیں سوائے اس مرد کے۔!

"کون ہے یہ؟"، کیا کرتا ہے؟۔ کیا نام ہے اسکا۔؟

کچھ عرصے کے بعد جب کنور مراتب علی میری میز پہ آتے ہیں، تو میں ان سے پوچھتا ہوں۔

"کون؟ وہ؟"۔ وہ آنکھوں سے اشارے کر کے پوچھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں شرارت جھانک رہی ہے۔ بہت محظوظ معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں وہی۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"یہ مرزا کپتی ہیں۔!"

"مرزا کپی ہیں۔؟"

"ہاں۔!"

"عجب نام ہے۔" میں غور کرتا ہوں۔

"ان کا اصلی نام تو مرزا رجب علی ہے۔ مگر اب انہیں کوئی ان کے اصلی نام سے نہیں جانتا۔ سب انہیں مرزا کپتی کہتے ہیں۔"

"کیوں۔؟"

"دلچسپ قصہ ہے۔ سنو گے۔؟"

"ہاں۔!"

کنور مراتب علی نے ایک گزرتے ہوئے بیرے سے آنکھیں ملائیں۔ بیرہ وہیں مودب ہو کر رک گیا۔ کنور مراتب علی نے ایک ڈبل وہسکی کا آرڈر دیا۔ اور جب وہسکی آ گئی تو ایک گھونٹ بھر کر بولے۔

"مرزا جی خاندانی رئیس ہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ رئیس تھے۔ آج کل تو جس کے پاس روپیہ ہے وہی رئیس ہے۔ کنور مراتب علی کسی قدر تلخی سے بولے۔ مگر مرزا جی واقعی خاندانی رئیس ہیں اور آصف گڑھ کے چوٹی کے خاندانوں میں ان کے خاندان کا شمار ہوتا ہے۔ دور پار کی ہماری بھی ان سے رشتہ داری ہوتی ہے اس لئے میں ان کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ نوجوانی میں مرزا جی بہت رنگین مزاج تھے۔ کون نہیں ہوتا صاحب؟ جس کے پاس روپیہ ہو۔ زمینداری ہو۔ محل ہو۔ درجنوں نوکر چاکر، باندیاں۔ لونڈیاں حکم کے ایک

اشارے کی منتظر ہوں، اور زندگی صرف ایک ہو تو کون اس کے بھرپور مزے لوٹنا نہیں چاہے گا۔ ہم جاگیرداروں کو سب گالیاں دیتے ہیں۔ مگر ان نئے جاگیرداروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جنھوں نے پرمٹ، کوٹے اور ٹھیکے سے نئے محل تعمیر کئے ہیں۔ انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ پرانی جاگیروں کو ختم کر کے نئی جاگیریں پیدا کر کے آپ نے کس کا بھلا کیا ہے؟ میں کہتا ہوں یہ جمہوریت بالکل فراڈ ہے۔ غریب لوگ ہمیشہ جوتے کی نوک سے مارے جائیں گے۔"

بجا فرمایا"، میں نے کہا۔ لیکن وہ مرزا کپّی۔؟ میں نے پھر اصل داستان کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر وہسکی کے گلاس کی طرف۔ کنور مراتب علی میرا اشارہ سمجھ گئے۔ گلاس اٹھا کر انھوں نے تین بڑے بڑے گھونٹ لئے، اور گویا جاگیرداری کے خاتمے کی پوری کڑوی گولی نگل لی۔ پھر دزدیدہ نگاہوں سے بائیں کونے میں بیٹھے ہوئے مرزا کپّی کو دیکھا۔ دیکھتے ہی انہیں جو کچھ یاد آیا اس سے وہ بےحد محظوظ ہو کر بولے۔

ایک زمانہ تھا۔ مرزا کپّی کا وہ بھی؟ اس عمر میں اس قدر وجیہہ معلوم ہوتے ہیں تو سوچ لیجئے جوانی میں کیا نہ ہوں گے۔ بھرا بھرا جسم شباب کا اٹھان اس پر دولت کا خمیر اور رئیسوں کی روایتی۔ بے فکری، خوش باش، خوش کلام، ہر وقت خوشامدی مصاحبوں میں گھرے رہتے۔ اور جناب میں پوچھتا ہوں ہمارے مصاحبوں کے وجود میں جو اس قدر کیڑے دکھائی دیتے ہیں، آپ لوگوں کو۔ تو ان ورجنوں خوشامدیوں اور چاپلوسی کرنے والے

فنکاروں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ جو آجکل لیڈروں۔ وزیروں تو دولتیوں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ہمارے مصائب تو جناب پھر بھی اپنے اپنے فن میں طاق ہوتے تھے کوئی لطیفہ گوئی میں۔ کوئی حاضر جوابی میں۔ کوئی مرغ بازی میں۔ کوئی پتنگ بازی میں کوئی چوسر میں۔ تاش میں گنجفے میں۔ آج کل کے مصاحبین کو کیا آتا ہے سوائے جوتی چاٹنے کے۔؟"

کنور مراتب علی پھر بھڑک گئے اور اصل داستان سے بھٹک گئے ہیں۔ میں نے جلدی سے ان کا وہسکی کا گلاس ان کی طرف سرکا دیا۔ دو بڑے بڑے گھونٹ پینے کے بعد کہیں ان کی طبیعت بحال ہوئی طبعی نشاشت خوش ادا تبسم کی طرح کھل کر ان کے چہرے پر دوڑنے لگی۔ ماضی کی یادوں میں گم ہو کر بولے۔

"بخدا آصف گڑھ میں ایک طرح سے ان کی اپنی حکومت تھی حالانکہ حکومت انگریز کی تھی۔ مگر صاحب لوگ پرانے خاندانی رئیسوں اور تعلقہ داروں کی عزت ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ اب تو وہ چلے گئے اور پیٹھ پیچھے ہے ان کا علی الاعلان کہتا ہوں خوب لگے تھے وہ کبھی ہمارے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیا۔ مرزا کبھی بھی اپنے ماں باپ کے لاڈلے اور چہیتے تھے۔ اور آصف گڑھ میں کھل کھیلتے تھے اور ان کو روکنے ٹوکنے والا کون تھا۔ اہل محلات کی لونڈیاں، باندیوں پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر محل سے باہر نکل کر ان کی نگاہیں آصف گڑھ کی گلیوں میں پہنچنے لگیں جو گدڑی کے لال ایک طرح اندھیری گلیوں میں سات پردوں کے اندر چھپی

رہتی ہیں۔ پھر گلیوں سے نکل کر اطراف داکنات کے نواحی علاقوں میں انھوں نے گل چینی شروع کی۔ جھنڈے گاڑ دیئے تھے مرزا جی نے اپنی جوانی کے۔ اور جوانی بھی کتنی دیوانی تھی۔ ان کی خوبصورت عورت پر یوں گرتے تھے۔ جیسے باز اپنے شکار پر۔ بھری محفل سے اٹھا لے جاتے تھے۔ گھر سے نیگھٹ سے۔ قصبے سے کی کچی سڑک سے کھیت سے۔ جنگل سے۔ جہاں سے جی چاہتا اغوا کر لے جاتے۔ سارے علاقے میں ان کی دلیری اور جبارت کی دھوم تھی۔ بڑے سے بڑے جاگیر داروں کے لڑکے خار کھانے لگے تھے ان سے!

یہ کہہ کر کنور مراتب علی ایک لمحے کے لئے چپ ہوئے اور انھوں نے ایک لمحے کے لئے چور نگاہوں سے تعریفی انداز میں مرزا کپّن کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف پلٹ کر بولے۔

ان دنوں ایک بادات کے علاقے میں خانہ بدوش بلوچیوں کا ایک قافلہ آکے رکا۔ اس قافلے میں یوں تو ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت بلوچن تھی۔ مگر جس بلوچن پر مرزا کا دل آیا وہ کافر ادا واقعی قیامت خیز تھی۔ اونچا پورا قد، پانچ فٹ آٹھ انچ۔ تندرست اور تنومند جسم۔ سیاہ بال۔ بڑی بڑی آنکھیں شعلے کی طرح دہکتے ہوئے لب و رخسار اور سینے کی منہ زوری؟ معاذ اللہ کچھ نہ پوچھیے، یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی قمیض پھٹ جائے گی اور سینے کے طائر فضا میں پرواز کر جائیں گے اور جناب بالکل اصل معاملہ تھا۔ اصل آج کل کی چولیوں کی طرح نہیں۔ کہ اوپر سے بھری کٹوری اور اندر سے خالی۔

"بس کیجئے، خدا کے لئے میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ کنور مراتب علی جب پی کر بہکتے ہیں تو حفظ مراتب بھول جاتے ہیں۔ آگے چلیئے۔!"

"تو جناب"۔ کنور مراتب علی نے ایک چسکی لی اور بڑے مزے مزے میں اپنی زبان پر پھرائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بلوچن کے "قاتل حسن کے تذکرے نے ان کی خاکستر کو ہوا دے دی تھی۔ اسی لئے شاید آنکھوں میں چنگاریوں کی سی چمک آگئی تھی۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔

بس پھر کیا تھا۔ مرزا جی۔ جی جان سے اس بلوچن پر مر مٹے اور اس کافر ادا کو حاصل کرنے کے لئے سوجتن کرنے لگے۔ مگر وہ ستم پیشہ قابو میں نہ آئی۔ اسی دوران میں ادھر ادھر کی کئی بلوچنیں اور اسی قافلے کی انھوں نے زیر بار کیں۔ مگر وہ قتالہ ان سے دور دور رہی۔ اسکا دو سال کا ایک بچہ تھا۔ اور ایک خاوند تھا۔ بچے کے لئے تحائف بھیجے گئے۔ اور خاوند کے لئے شراب، اور دونوں چیزیں اس طرح قبول کر لی گئیں۔ جیسے یہ تو ان کا حق تھا۔ مگر معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ اور پیشہ ور دلالوں، اور کٹنیوں کی تمام ترکیبیں ناکام رہیں۔ مگر تحفے، تحائف برابر قبول کئے جاتے رہے۔ اس سے مرزا جی کو اور بھی غصہ آیا۔ یعنی مال بھی کھوتے ہیں۔ اور الو بھی بنتے ہیں۔ عجب کینڈے کی عورت ہے یہ! جب جملہ مصاحبین کی مچھانسے بازیاں ناکام ثابت ہوئیں، تو اغوا کا پروگرام بنایا گیا۔ بلوچن ہر روز سر پر ٹوکری رکھے اور پیٹھ پر بچہ باندھے، بڑے ٹھاٹ سے سینہ تانے آصف گڑھ کی گلیوں میں جاتی تھی

اور سرِ شام اپنا کام ختم کر کے اپنی قیام گاہ کو لوٹتی تھی۔ جو آصف گڑھ سے آدھے میل کی دوری پر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر خیموں کی صورت میں موجود تھا۔ کچی سڑک تھی اور راستے میں ڈوم، پاسیوں اور چماروں کی جھونپڑیوں کے سوا کچھ نہ ملتا۔ اور ان لوگوں میں سے کسی کی ہمت ہو سکتی تھی کہ بلوچن کی مدد کو آ سکے۔ لہٰذا طے پایا کہ چار نیزا ور طرار مصاحب اس کچی سڑک پر تیلی شاہ کے مزار سے پرا مینوں کے موڑ پر بلوچن کو گھیر لیں گے اور اُسے زبردستی اٹھا کر محل میں لے آئیں گے، اور پھر وہی ہو گا جیسا کہ اب تک ہوتا آیا ہے۔

"اس موقع پر میں بھی موجود رہوں گا۔" مرزا جی نے اصرار کیا۔

مصاحبین نے بہتر سمجھایا کہ یہ آدابِ ریاست کے خلاف ہے۔ آخر آپ کے جاں نثار کس کام آئیں گے؟ مگر مرزا نہیں مانے (حالانکہ مصاحبین دوسری وجہ سے نہیں چاہ رہے تھے کہ مالِ غنیمت کو محل تک پہنچنے سے پہلے اس پر مصاحبین کا بھی حق ہوتا ہے۔ یہ حق گویا ایک طرح سے محل میں داخل ہونے کا پاسپورٹ ہوتا ہے، پروانہ راہ داری ہوتا ہے، یا چنگی کا محصول ہوتا ہے۔ کچھ بھی سمجھ لیجئے۔)

"پھر کیا ہوا۔؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ڈبل پیگ منگا لوں تو آگے چلوں۔" کنور مراتب علی بولے۔

اور انھوں نے بیرے کو دوسرے ڈبل پیگ کا آرڈر دیدیا۔

میں نے مرزا کپی اور ان کے خاندان کی طرف دیکھا۔ وہ سب لوگ انتہائی قاعدے اور قرینے سے دھیمے دھیمے گفتگو کر رہے تھے اور سنگتروں کی بارش لانبی لانبی سفید ڈنڈیوں سے پی رہے تھے۔

ہال روم میں ناچ شروع ہو گیا تھا۔ کنور مراتب علی نے ناچ کی گت سے سنی غور کیا، آنکھیں موند لیں، دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے چند لمحوں کے لئے انھوں نے اپنے جوتے کے تلے سے ناچ کی گت کو بجایا۔ دوسرے ڈبل پیگ کا ایک گھونٹ لیا اور بولے۔

کچھ ایسی ہی شام تھی دھندلی دھندلی اور شفق آمیز۔ کچھ سڑک پر بیل گاڑیاں ایک تاریخی غبار چھوڑ گئی تھیں اور اس غبار میں ان چاروں مصاحبوں نے موڑ سے اس بلوچن کو یوں طلوع ہوتے دیکھا جیسے آفتاب سحر کے گلابی بادلوں سے برآمد ہوتا ہے۔ ایک اونچی پوری تنومند، صحت مند، تندرست چاق چوبند عورت سر پر ٹوکری رکھے اور ٹوکری میں رات کے کھانے کا سامان رکھے بچہ اپنی پیٹھ پر باندھے لمبے لمبے ڈگ بھرتی، تیزی سے چلی آ رہی تھی اور مصاحبوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی، بلوچن نے ایک ہاتھ سے مصاحب کو جھٹکا دیا۔ دوسرے کو دوسرے ہاتھ سے نیچے گرا دیا۔ اور سینہ تان کے آگے بڑھی تو دو مصاحب اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھے مگر بلوچن کو سینہ تان کے سامنے سے آتے دیکھ کر کائی کی طرح پھٹ گئے۔ بلوچن راستہ پا کر آگے بڑھی تو اب مرزا جی نظر آئے۔

نوجوان مرزا کی نظریں بلوچن کے سینے پر پڑ گئی تھیں، جیسے وہ اس کے جسم کا کوئی اور حصّہ نہ دیکھ رہا ہو، سوائے اس کے سینے کے جیسے وہ نگاہیں گوند سے بلوچن کے سینے سے چپکا دی گئی ہوں۔ نوجوان مرزا اغواہ کی سب ترکیبیں بھول کر حیرت میں ڈوبا۔ بلوچن کو تاکتا رہ گیا۔

بلوچن اس کے قریب سے گزر گئی۔

مرزا وہیں ٹھٹھر اکھڑا رہ گیا۔

پھر بلوچن واپس آگئی اور سینہ تان کے مرزا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

کیا ہے۔ ؟ بلوچن نے بڑی دلیری سے مرزا جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ اس غیر متوقع سوال سے مرزا کی گھگھی بندھ گئی۔ کچھ بول نہیں سکے۔!

بلوچن نے آگے بڑھ کر مرزا جی کو گردن سے پکڑ لیا۔ جلالی آواز میں گرج کر بولی۔

"ہم روج ادھر سے گزرتا ہے تم روج ہم کو دیکھتا ہے۔ ادھر سینے پر دیکھتا ہے ادھر کاہے کے واسطے دیکھتا ہے ؟ ایں ؟ بولو؟ کاہے کے واسطے دیکھتا ہے ادھر۔ ؟"

بلوچن نے ایک ہاتھ تو مرزا جی کی گردن پر رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے ان کے رخسار پر زور کا ایک طمانچہ مارا۔

مرزا جی زور سے چیخے۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔!"

مگر چاروں مصاحب بھاگ چکے تھے۔ چیخنے کی آواز سنکر چھپّروں

سے چمار، پاسی، کوی، نکلے، کچھ کھیتوں سے کھیت مزدور، وہ لوگ دوڑے دوڑے آنے لگے۔

"یہ ہمارے بچے کا کپتی ہے"، بلوچن اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "یہ ہمارے بچے کا کپتی ہے، تم ہمارے بچے کی کپتی کو بری نجر سے دیکھتا ہے۔ ہم تمہاری جان لے گا۔!"

بلوچن نے زور کا ایک اور دھپا دیا۔ مرزا جی نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر بلوچن نگڑی تھی۔ اس نے مرزا جی کی گردن نہیں چھوڑی۔

"ارے یہ چھوٹے مرزا جی ہیں۔" ایک چمار نے بلوچن کی خوشامد کی۔ "یہ تو ہمارے سرکار ہیں۔ انھیں چھوڑ دو، چھوٹے مرزا جی ہیں یہ تو۔!"

"چھوٹے مرجا ہوں کہ بڑے مرجا، میں نہیں چھوڑوں گی۔ جب تک اس چھوکرے کو ٹھیک نہیں کر لوں گی، کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

بلوچن غصے میں آکر اپنی چھاتیاں کھول رہی تھی۔ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ارے کیا کرتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟" بہت سے لوگ چیخے۔

مگر قمیض کا ایک بٹن کاج میں ایسا آکے پھنسا، جیسے بلوچن کی مٹھی میں مرزا جی کی گردن پھنس گئی تھی۔

آخر بلوچن نے زور کا جھٹکا دیکر غصے میں اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ اپنے ہاتھ میں اپنی چھاتی کو لیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اس نے مرزا جی کی

گردن زور سے نیچے کی اور پھر زبردستی اپنی چھاتی اس کے منہ میں دیدی۔

"لے۔ حرامجادے۔ پی میرے بچے کا کیتّی۔!"

اس وقت پچاسوں آدمی مرزا جی اور بلوچن کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ مگر بلوچن اس قدر بھپری ہوئی تھی کہ کسی کی منت سماجت پر کان دھرنے کی ضرورت روادار نہ تھی۔ اس وقت تک اس نے مرزا کی گلو خلاصی نہیں کی، جب تک اسے اپنی چھاتی کا دودھ نہ پلا دیا۔

اس رات مرزا جی کہیں غائب ہو گئے اور پھر بیس برس تک واپس نہیں آئے۔ بیس برس کے بعد جب آصف گڑھ لوٹے تو ایک معقول بیوی اور چار بچے لیکر لوٹے اب وہ ایک کامیاب انجنیئر ہیں، نہایت معقول اور نہایت مہذب شخص ہیں۔ آج تک ان کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ ۔"

داستان ختم کر کے کنور مراتب علی خاموش ہو گئے ہیں اور وہ دونوں چپ چاپ مرزا اکیتی کے خاندان کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں جگمگ پور کی رانی سینہ تانے ہوئے گارڈ روم سے نکلیں۔ اتنے عرصے میں انھوں نے ایک اور نئی چوٹی بدل لی تھی جو پہلی چوٹی سے بھی زیادہ تیز اور تندخو معلوم ہوتی تھی۔

قریب آکر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کنور مراتب علی سے بولیں۔

"بڑا اسور ہے! مجّو، میری طرف دیکھتا ہی نہیں!"

ان کی آواز میں آنسو تھے۔!

۔ ختم ۔

مکئی کے دانے

وہ درختوں کی طرح اکٹھے بڑھے تھے۔ قریب جیسے جڑیں ایک دوسرے میں پیوست ہوں اور شاخیں ڈالیوں کی انگلیاں بڑھا کر ایک دوسرے کو چھو لیں اور ہرے ہرے پتوں سمیت قہقہے لگائیں۔ ان کی محبت ان کی طرح ہری کچی اور ناتجربہ کار تھی۔

مگر وہ اسے پسند تھی۔ اسے اپنے علاقے کا ڈوگری حسن پسند تھا۔ جو نہ یو، پی کی طرح تیکھا اور سلونا ہوتا ہے نہ کشمیر کی طرح صبیح اور موم کی طرح نرم ہوتا ہے نہ پنجابی کی طرح وزن دار ہوتا ہے۔ ایک فوجی ہونے کی حیثیت سے اس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی فوجی چوکیوں پر طرح طرح کا حسن دیکھا تھا مگر وہ ٹھاکرانی کو کبھی نہیں بھول سکا۔ گوری اور گنے کی طرح رس دار اور الھڑ ملکھ بے وقوف اپنی پتلی کمر کے باوجود سر پہ چار گھڑے اٹھا کر تین میل کے فاصلے سے روہی کے چشمے سے پانی لانے والی اور تپتی دوپہر میں ریوڑ کو لے کر گیت گانے والی ٹھاکرانی کی آواز چیل کی طرح اڑتی تھی۔ اور وہ دور کے فاصلے سے اسے سن سکتا تھا۔ بچپن سے یہ اس کی عادت تھی اور کوئی کہیں

کتنے ہی برس کے لئے چلا کیوں نہ جائے، اپنے بچپن کی عادت کیسے بھول سکتا ہے۔

ٹھاکرانی نے اسے اپنے مکّی کے بھٹے سے پندرہ دانے بھون کر دیئے اور بولی "گن لو پورے پندرہ ہیں۔"

ٹھاکر سنگھ نے اپنی ہتھیلی آگے سرکائی تو ٹھاکرانی نے غرور سے اپنی گردن اونچی کی اور بخشش کرتی کسی شہزادی کی طرح اپنی ہتھیلی نیچے سرکائی اور دانے ٹھاکر سنگھ کی ہتھیلی پر ڈال دیئے۔ ایک لمحے کیلئے ٹھاکرانی کی ہتھیلی سے مس ہوئی اور ٹھاکر سنگھ کو ایسا لگا جیسے دور، دور تک شاخیں پتوں سے بھر گئیں۔

ٹھاکر سنگھ نے گن کر کہا۔

پندرہ نہیں، بارہ ہیں۔"

"نہیں پورے پندرہ ہیں۔ گن کر دیکھو۔"

"کیسے پندرہ ہیں، پورے بارہ ہیں۔ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔"

ٹھاکر سنگھ نے ہتھیلی دکھاتے ہوئے کہا۔

ٹھاکرانی نے ہتھیلی پر اپنی خوبصورت انگلی رکھ دی، اور ٹھاکر سنگھ کو ایسے لگا جیسے کبوتری شاخ پر بیٹھ گئی۔ پھر ٹھاکرانی شرارت سے مکّی کے دانے دبا دبا کر کہنے لگی۔

ایک دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو دس، گیارہ، بارہ

اور پھر میں جگہ خالی ہتھیلی پر چٹکی بھرتے ہوئے بولی تیرہ ۔ چودہ ،
پندرہ ! ہو گئے نا پورے پندرہ ؟ وہ اپنی کالی، کالی شوخ آنکھیں جلدی
جلدی جھپکتے ہوئی بولی ۔

" ہاں ہو گئے ۔ " ٹھاکر سنگھ نے مسرت کا ایک گہرا سانس لے کر کہا اور
ہتھیلی کو نچا کر مکئی کے باقی دانوں کا پھنکا اپنے منہ میں ڈال لیا۔ مکئی کے سنہرے
سنلے ہوئے کرکرانے دانے اس کے منہ میں کرکراتے ہوئے ٹوٹنے لگے اور ٹھاکر
سنگھ کو خیال آیا کہ ٹھاکرانی کا حسن بھی بالکل ایسا ہی ہو گا ۔

جلدی جلدی مکئی کے بھٹے سے دانے نکالتے ہوئے ٹھاکرانی نے اپنی ہتھیلی
بھری پچیس دانے ہوں گے ۔ وہ جلدی سے پھنکا کر انھیں کھا گئی ۔ ٹھاکر سنگھ نے
فوراً اس کی کلائی پکڑ کر کہا " تم زیادہ کھا گئے ۔ "

" نہیں ۔ " ٹھاکرانی زور سے چیخی " پورے پندرہ تھے ۔

" نہیں ۔ زیادہ کھائے ۔ " ٹھاکر سنگھ نے اصرار کیا ۔

جواب میں ٹھاکرانی نے دوسری بار اتنے ہی دانے مکئی کے بھٹے سے نکال کر
کھا لئے اور بولی " ہاں کھائے پھر ۔

جواب میں ٹھاکر سنگھ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا ۔

" ایک ہاتھ دوں گی ۔ " ٹھاکرانی نے فوراً اپنا ہاتھ اٹھا کر غصے سے
کہا ۔ اور ٹھاکر سنگھ نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تو وہ یکایک
نرم ہو کر بولی ۔

" تم باپو سے بات کیوں نہیں کرتے ہو ۔ ؟ "

"کی گلاں دا اے؟ باپو؟" ٹھاکر سنگھ نے پوچھا۔

"باپو کہتا ہے میں ٹھاکرانی کی سنگھ سے نہیں کروں گا۔" وہ بولی۔

"کیوں۔؟"

"کیونکہ دونوں کا نام ایک جیسا ہے۔"

"یہ کوئی بات نہیں۔" ٹھاکر سنگھ غصّے سے بولا۔ اگر دو بیری کے جھاڑ ساتھ ساتھ اگیں تو لوگ دونوں کو بیری کہیں گے پیپل تو کہیں گے نہیں۔"

"اچھا۔ میں بیری کا جھاڑ ہوں۔" ٹھاکرانی تنک کر بولی۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" ٹھاکر سنگھ نے سہم کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ میں بیری کا جھاڑ ہوں۔ میں سوکھی سوکھی کانٹوں والی ننگی بچی شاخوں والی بیری ہوں میں تجھ کو چبھتی ہوں نا۔" ٹھاکرانی آبدیدہ ہونے لگی۔ تو جا۔ جا کے کوئی دوسرا کر لے۔"

"کیوں خواہ مخواہ الجھتی ہے۔"

"میں بیری کا جھاڑ جو ہوئی الجھوں گی نہیں تو اور کیا کروں گی۔"

"تو مجھے غلط سمجھتی ہے۔"

"غلط نہیں سمجھوں گی اور کیا کروں گی۔! تم۔ باپو سے بات کیوں نہیں کرتے ہو۔؟"

ٹھاکرانی کے گلابی ہونٹوں پر سنکی ہوئی ہنسی کے چلے ہوئے چھوٹے چھوٹے چھلکے دیکھ کر ٹھاکر سنگھ دیوانہ وار آگے بڑھ گیا فوراً ٹھاکرانی نے پیچھے

ہٹ کر اپنا ہاتھ اٹھایا۔

"ایک ہاتھ دوں گی۔ پہلے باپو سے بات کر۔"

۔ از ۔

شام کو ٹھاکر سنگھ نے بے تحاشہ شراب پی اور اپنے باپ کی بندوق لے کر چلا گیا۔ ٹھاکران کے گھر جا کر اس نے اپنی بندوق کی نالی اٹھا کر ان کے باپ کے سینے پر رکھ دی اور بولا" بول شادی کرتا ہے یا نہیں۔؟"

"کس کی شادی؟ کس سے۔؟"

ٹھاکران کی مجھ سے۔ تیس برس کا ہو گیا ہوں۔ حوالدار بھی ہو گیا فوج میں۔ ابھی تک ٹھاکران کے لئے کنوارہ ہوں۔ پرسوں لداخ جا رہا ہوں۔ اس لئے کل شادی ہو گی نہیں تو کھڑے کھڑے یہ بندوق داغ دوں گا تیرے سینے میں۔ بول۔!"

ٹھاکران کا باپ زور سے ہنسا۔ سینے پر رکھی ہوئی بندوق کی پرواہ کرتے ہوئے مڑا، اور اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"گنگا! یاد ہے تجھ کو۔ میں بھی تیرے باپ سے اسی طرح رشتہ مانگنے آیا تھا۔"

پھر زور زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا، اور زور سے ہاتھ مار کر اس نے ٹھاکر سنگھ کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا۔

کوئی دس ماہ بعد لداخ کی ایک جوکی پر میجر ہزارا سنگھ نے اس سے کہا۔ "اٹن شن۔"

حوالدار ٹھاکر سنگھ اٹن شن ہو گیا۔

"سیلوٹ!" میجر ہزارا سنگھ گرج کر بولا۔

حوالدار سنگھ نے سیلوٹ مارا۔

میجر ہزارا سنگھ نے حوالدار ٹھاکر سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کی نگاہ میں عقاب کی سی ہیکڑی اور بیباکی تھی۔ میجر کو اس کے ماتحت کام کرنے والے خیفہ طور پر "کڑ" کہتے تھے۔ کیونکہ اس کی ناک بڑی لمبی اور ٹیڑھی تھی۔ میجر کے لہجے سے ٹھاکر سنگھ ایک دم چوکنا ہو گیا اور سوچنے لگا۔ جانے آج اس نے کونسی غلطی کی ہے۔ میجر بہت گرم ہو رہا ہے۔

میجر ہزارا سنگھ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ایک پیلا کاغذ ہاتھ میں اٹھایا اور کڑکتی ہوئی آواز میں بولا۔

"حوالدار ٹھاکر سنگھ تمہاری چھٹی پندرہ دن کے لئے منظور کی گئی ہے اور تمہاری بیوی کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ اور تم اسی وقت جا سکتے ہو۔"

"اٹین شن۔"

حوالدار ٹھاکر سنگھ اٹین شن ہو گیا۔

"سیلیوٹ۔"

حوالدار نے سیلیوٹ مارا۔

میجر ہزارا سنگھ نے کاغذ پر ایک گول دستخط کر کے حوالدار کے ہاتھ میں دیا جو اس نے آگے بڑھ کر لے لیا۔ اور پیشتر اس کے کہ حوالدار ٹھاکر سنگھ میجر ہزارا سنگھ کا شکریہ ادا کر سکتا، میجر ہزارا سنگھ کڑک کر بولا۔

"آل رائٹ۔ اباؤٹ ٹرن۔"

حوالدار ٹھاکر سنگھ نے بڑی پھرتی اور مشاقی سے اباؤٹ ٹرن مارا۔

"ڈسمس۔!"

میجر ہزارا سنگھ ایسی خوفناک آواز میں چلایا جیسے وہ حوالدار ٹھاکر سنگھ کو گھر بھیجنے کے بجائے اگلے مورچے پر بھیجنے کا حکم دے رہا ہو۔ جب حوالدار چلا گیا تو میجر ہزارا سنگھ نے اپنی لمبی اور ٹیڑھی ناک کے نیچے خوفناک بچھو کے ڈنک والی مونچھوں کو تاؤ دیکر کسا۔ اور ذرا سا مسکرا دیا۔ اس کا چہرہ خشونت آمیز تھا۔ آواز بھاری اور خوفناک سپاہیوں سے ڈیوٹی لینے میں وہ انتہائی سخت گیر مشہور تھا۔ چوکی کے سب سپاہی اس سے ڈرتے تھے اور ہر وقت چاق و چوبند رہتے تھے۔ کب جانے میجر صاحب کیا حکم دے دے؟ اسکا بھروسہ نہیں کب کیا جانے کیا کہہ دے اس لئے ہر وقت الرٹ رہنا ہی اچھا ہے۔

میجر ہزارا سنگھ سے رخصت ہو کر حوالدار ٹھاکر سنگھ چوکی کے سب سے اونچے اڈے کی طرف بھاگا، جہاں اس کی مشین گن کا گھونسلا تھا۔ وہ یہ خبر خود اپنے ساتھیوں کو سنانا چاہتا تھا۔ مارے حسد اور جلن کے

خاک ہو جائیں گے۔ سکھ چین سنگھ۔ آسا رام اور بے چارہ شیر خاں تو بغلوں میں منہ چھپا کر رو دے گا۔ کیونکہ اس کی چھٹی ابھی منظور نہیں ہوئی تھی۔ بڑا مزا آئیگا۔ ان لوگوں کے چہرے دیکھ کر۔

تیز تیز قدموں سے چڑھتا ہوا وہ چوکی کے سب سے اونچے اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں شیر خاں اور آسا رام اپنی مارٹر ٹھیک کر رہے تھے اور سکھ چین سنگھ اسکا ساتھی مشین گن کا اسلحہ دیکھ رہا تھا۔

حوالدار ٹھاکر سنگھ ان کے قریب جا کر چلایا اور اپنی جیب سے اپنی بیوی کا خط نکال کر دکھاتے ہوئے بولا۔

"میرے گھر لڑکا ہوا ہے۔"

شیر خاں اور آسا رام نے پلٹ کر ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ ایسی حقارت سے جیسے وہ اپنے سامنے ایک خارش زدہ کتے کو دیکھ رہے ہوں دوسرے لمحے وہ پلٹ کر اپنی مارٹر کے کام میں لگ گئے۔

اور مجھے پندرہ دن کی چھٹی بھی مل گئی ہے۔ ٹھاکر سنگھ نے دوسری جیب سے دوسرا کاغذ نکال کر ہوا میں لہرایا۔ پیلا مٹیالا سا کاغذ جس پر میجر کے گول گول دستخط تھے۔

سکھ چین سنگھ نے اپنے ساتھی کی طرف ایک بار رحا نوشی سے دیکھا۔ پھر دوربین اٹھا کے اپنی آنکھوں سے لگائی اور سامنے نیچے جھیل کے پار ان ناتوا ونچے پہاڑوں کو دیکھنے لگا۔ جہاں دشمنوں نے اپنے اڈے جمائے تھے۔ مگر وہ بھی کچھ نہیں بولا۔ اپنے ساتھیوں کا یہ ردعمل دیکھ کر ٹھاکر سنگھ کھسیانا

ہو گیا اور چھٹی کا کاغذ اور بیوی کا خط دونوں جیب میں ڈال کر ان سب کی طرف پیٹھ کر کے اپنی مشین گن پر بیٹھ گیا اور دانت پیس کر بولا۔

"ورڈ۔"

یہ سنتے ہی وہ تین اس کی طرف دوڑے اور پیشتر اس کے کہ ٹھاکر سنگھ اپنے آپ کو بچائے یا مزاحمت کر سکے۔ وہ تینوں اس پر حملہ آور ہو گئے اور اس کی پیٹھ، پسلیوں اور شانوں پر مکے مار مار کر کہنے لگے۔

"ابے سالے کمینے اپنے لڑکے کی پیدائش کا ذکر اس فخر سے کرتا ہے جیسے ... مورچہ سر کر کے آ رہا ہے؟ سور کی اولاد کتے دے پتر۔ تو گھر جائیگا۔ اپنی بیوی کو گلے لگا۔ اور یہاں ہم تیری مشین گن کا چرغہ سنبھالیں گے۔

وہ لوگ اسے کوس کوس کر گالیاں دے رہے تھے اور چاروں طرف سے مکے اور گھونسے مار رہے تھے اور وہ ان ... سب کے بیچ میں فٹ بال بنا ہوا تھا اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہوا خوشی سے نہتا جاتا ہے اپنے دوستوں کے مکے اور گھونسے اس وقت اسے پھولوں سے بھی نرم اور پیارے معلوم ہو رہے تھے۔

ایک رات کے لئے انھیں گھر جانے سے روک دیا۔ سکھ چین سنگھ اسی کے گاؤں کا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کے لئے کچھ تحفے بھیجنا چاہتا ہوں۔ اور

ایک خط راستے میں تو نہیں، لیکن ذرا فاصلے پر شیر خاں کا گاؤں بھی تھا۔ اور شیر خاں کا اصرار تھا کہ ٹھاکر سنگھ اس کے گھر بھی جائے اور اس کی خیر خبر سکھ سانسے کے آئے۔ پھر وہ سب لوگ اسے رخصت کرنے سے پہلے اس کی دعوت کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے رات بھر کے لئے رکنا بیحد ضروری ہو گیا۔

رات کا کھانا کھا کے وہ لوگ اوپر چوکی کے اڈے پر آ بیٹھے۔ کئی دن کے بعد آسمان صاف نظر آیا تھا۔ اور اکسائی چن کے پہاڑوں پر چاند میجر کے گول دستخط کی طرح چمک رہا تھا۔ نیچے جھیل کی سطح پر گلیشئر کا ایک بڑا ٹکڑا تیر رہا تھا اور اس کے ارد گرد چاندی ایک ہالے کی طرح کھنچی ہوئی تھی۔

ایک سال سے وہ اس فوجی چوکی پر تھے۔ مگر آج تک کبھی دشمن سے لڑائی کا موقع نہیں آیا تھا۔ انھیں معلوم تھا۔ کہ جھیل کے آس پاس اونچے پہاڑوں پر فوجوں کے اڈے ہیں۔ مگر... فوجیوں سے آج تک ان کی مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی اسی لئے کھانا کھانے کے بعد سب کے دل میں طمانیت تھی اور کسی کا دل اس وقت چوکی میں نہیں تھا۔ ٹھاکر سنگھ کی چھٹی کی خبر سے ان سب کے ذہن اپنے گھروں میں تھے جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے اکسائی کے یخ لبستہ پہاڑ غائب ہو گئے تھے اور دور نیچے سرسبز گھاٹیوں اور وادیوں میں چھپے ہوئے گاؤں گویا شیر خوار بچے کی طرح دھرتی کے سینے سے لگے چپٹے معصوم اور خوبصورت نظر آنے لگے تھے۔

شیر خاں بولا۔ اسی مہینے کی اکیس تاریخ کو سمالے گاؤں سے باہر بدیع الزماں خواجہ کے مزار پر میلہ لگتا ہے۔ میری بیوی کو بولنا کہ وہ اس موقعہ پر

میری جان کی سلامتی کے لئے نیاز دلانا نہ بھولے۔"

"بول دوں گا۔"

چند لمحے خاموش رہی بشیر خاں پھر بولا۔

"میرے آنے کے بعد میری بھینسیں کے ہاں کٹی ہوئی تھی۔ اسے کبھی پوچھ

کے آنا۔"

"بہت اچھا۔"

آسارام نے ہوا کے برفیلے جھونکے سے بچتے ہوئے اپنے کوٹ کا کا

درست کیا۔ اور آہستہ سے خواب ناک لہجے میں کہا۔

ان سردیوں میں میری شادی ٹیکاں سے ہونے والی تھی۔ اب نہ جا

کب ہوگی۔!"

کوئی کچھ نہ بولا۔

چند لمحوں کی خاموشی میں آسارام سوچنے لگا۔

"اس وقت ٹیکاں کے گھر کے لوگ کھانا کھا کے ہاتھ لمبے پڑے ہوں گے

وہ پچھلی فصل کے مکی کے بھنے ہوئے بھٹے آگ پر گرم کرکے کھا رہی ہوگی۔ اد

زلف کے کانوں کے پاس سے نیچے پھسل آئی ہوگی۔ اور آگ کی روشنی میں بیر

کے جھمکے چمک رہے ہوں گے۔

ٹیکاں کو مکی کے بھٹے اور پکے ہوئے اخروٹ اور خشک خوبانیا

بہت پسند ہیں۔" آسارام ہولے سے بولا۔

پھر کوئی کچھ نہ بولا۔ یکایک سکھ چین سنگھ کو ہچکی آنے لگی۔

"کوئی تمہیں یاد کر رہا ہے۔" شیر خاں نے سکھ چین سنگھ کو بتایا۔ کیونکہ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہچکی اسی وقت آتی ہے جب کوئی کسی کو یاد کرتا ہے۔

"کون ہے تمہاری وہ یاد کرنے والی۔؟" شیر خاں نے سکھ چین سنگھ سے پوچھا۔

سکھ چین سنگھ نے بڑی حیرت سے کہا۔

اس دنیا میں میری بڈھی ماں کے سوا... اور کوئی نہیں ہے۔"

اور پھر اس نے ہچکی لی۔

ہچکی سے ٹھاکر سنگھ کو شادی کی رات یاد آ گئی۔ لوگوں نے ٹھاکران کو اور اسے ایک الگ کمرے میں بند کر دیا تھا۔ کیونکہ صبح ٹھاکر سنگھ کو لداخ آنا تھا۔ اور لال جوڑا پہنے ہوئے۔ مہندی بھرے ہاتھوں والی ٹھاکران کو یکایک ہچکی لگ گئی تھی اور کسی طرح بند نہ ہوتی تھی اور یہ صرف ایک رات ان دونوں کو ملی تھی اور وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہچکی تھی جو کسی طرح بند نہ ہوتی تھی۔ ٹھاکر سنگھ نے کمرے میں پڑے ہوئے دودھ کے گلاس کو ٹھاکران کے منہ سے لگا دیا۔ مگر دودھ پی کر بھی ٹھاکران کی ہچکی بند نہ ہوئی۔ پھر اس نے مکئی کے دانے ہتھیلی بھر کر اس کے منہ میں ڈال دیئے اور انہیں چباتے چباتے ٹھاکران کا منہ دکھنے لگا۔ پھر بھی اس کی ہچکی بند نہ ہوئی۔ پھر ٹھاکر سنگھ نے اسے اخروٹ کھلائے اور بادام اور پھر کوزہ بھری کی بڑی ڈلی اس کے منہ میں رکھ دی۔ لیکن جب ٹھاکران کی ہچکی کسی طرح بند نہ ہوئی تو گھبرا کر ٹھاکر سنگھ نے ٹھاکران کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

اور ٹھاکر ان کی ہچکی بند ہو گئی۔

اس واقع کو یاد کر کے ٹھاکر سنگھ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے اپنی بیوی کی چھٹی نکالی جس میں اس کے ننھے بچے کی تصویر تھی۔ گول گول گتھلا سا پیارا سا بچہ ہنستا ہوا اس کی روشن آنکھوں کے گرد کاجل پھیل گیا تھا۔ اس کی کلائیوں اور کہنیوں میں کتنے پیارے گڈھے تھے۔ اور اس کی ٹھوڑھی تو بالکل باپ کی طرح تھی اور ہاں ناک بھی۔ اپنے چہرے کو اپنے بیٹے کے چہرے میں دیکھ کر ٹھاکر سنگھ بے اختیار خوشی سے مسکرا دیا۔ پھر اس نے جیب سے ایک ٹیلیگرام نکالا جو اس خط سے پہلے آیا تھا۔ جس میں اس کی بیوی کی علالت کا ذکر تھا جس کی وجہ سے اس نے چھٹی کی درخواست دی تھی، اور اب یہ خط اور یہ تصویر۔ ننھے مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ٹھاکر جی کا جی بے اختیار اسے گود میں لے کر چومنے کو چاہنے لگا۔

یکایک ایک ساتھ بہت سی گولیوں کے چلنے کی آواز آئی۔ بشیر خاں اس وقت اپنی مارٹر کے قریب کھڑا انگڑائی لے رہا تھا۔ گولی نے اسکا سینہ چھید دیا اور وہ قلابازی کھاتا ہوا زمین پر جا گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

پھر سامنے کے پہاڑوں سے بہت سی پھلجھڑیاں چھوٹیں اور توپوں کے دغنے سے پہاڑوں کے سینے لرزنے لگے اور ٹیلیفون پر آسا رام کو میجر نرائن سنگھ کی آواز سنائی دی۔

"حملہ شروع ہو گیا ہے"

اس خبر کے ساتھ بہت سے احکامات تھے۔

احکامات سننے کے بعد وہ لوگ اپنے اپنے مارٹروں اور مشین گنوں میں لگ گئے۔ گولیوں کی مسلسل تڑتڑاہٹ سے گویا رات کے سناٹے میں مسلسل سوراخ سے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر بیچ میں ایک چھوٹا سا وقفہ آیا۔ اس وقفے میں آسارام نے ٹھاکر سنگھ سے کہا۔

"میجر کو معلوم نہیں ہے کہ تم ابھی تک یہاں پر ہو، اس لئے تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ اپنی چھوٹی غلطی مت کرو۔"

"ہاں تم چھوٹی پر ہو۔" سنکھ چین سنگھ بولا۔

"کل چلا جاؤں گا۔" ٹھاکر سنگھ دھیرے سے مگر بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ صبح تو ہونے دو۔

اتنا کہہ کر وہ شیر خاں کے مورچے پر بیٹھ گیا۔ دو گھنٹہ کی مسلسل گولہ باری کے بعد جب ایک گولی نے سکھ چین سنگھ کی جان لے لی تو آسارام نے میجر سے کمک طلب کی۔

"کمک کہاں ہے۔؟" میجر ٹیلی فون پر بولا۔ دشمن نے آگے پیچھے اور دائیں تین طرف سے حملہ کیا ہے۔ چوکی نمبر چھ اور پانچ پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔

رات کے تیسرے پہر کے قریب میجر نے بتایا کہ چوکی نمبر دو چار اور تین بھی ہاتھ سے گئیں۔

پھر ٹیلیفون یکایک کٹ گیا۔

"ہیلو ہیلو۔" آسارام بار بار بولا۔ میجر صاحب۔ میجر صاحب؟ مگر ٹیلیفون مردہ ہو چکا تھا۔ چوکی نمبر دو سے بھی کوئی نہیں بول رہا تھا اور

ان کی چوکی کا نمبر ایک تھا۔

کوئی بیس منٹ کے بعد میجر ہزارا سنگھ اکیلا خون میں لت پت ایک مشین گن اپنے کاندھے پر اٹھائے ہانپتا ہوا ان کی چوکی پر پہنچا۔ اس کا چہرہ غم اور غصے سے لال تھا۔ اس نے چوکی پر کسی سے بات نہیں کی۔ وہ جدھر سے آیا تھا۔ ادھر ہی کی طرف اس نے مشین گن کا رخ نیچے کو پھیر دیا۔ اور مشین گن کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجہ میں بولا۔

دشمن میرے پیچھے پیچھے چڑھائی چڑھتا آرہا ہے۔ اپنی مارٹر کا رخ بھی اس طرف نیچے کو گھما دو۔ اور گولیوں کی باڑھ پر سب کو بھون دو۔ دشمن تعداد میں بہت زیادہ ہے اس لئے ایک لمحے کے لئے اسے راستہ مت دو۔ چلاتے ہو۔ چلاتے جاؤ۔ اس وقت تک چلاتے جاؤ۔ جب تک اسلحہ ختم نہ ہو جائے چوکی نمبر ایک کبھی فتح نہ ہوگی۔

صبح کے وقت یکایک گولیوں کی باڑھ بند ہوگئی، اور چاروں طرف ایک دردناک سناٹا چھا گیا۔ ان چند لمحوں کے سکوت میں حوالدار ٹھاکر سنگھ نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

چوکی نمبر ایک کی حفاظت کرنے والے سب فوجی مرے پڑے تھے۔ مشین گنیں ٹھنڈی تھیں۔ مارٹر خاموش، شیر خاں کا سر ایک گڈھے میں اوندھا رکھا تھا۔ اور اس کے کالے کالے گھنگھریالے بال ہولے ہولے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ آسا رام کا ایک ہاتھ مارٹر پر تھا۔ دوسرا ٹیلی فون

پڑا اور اس کے پیٹ سے خون بہہ بہہ کر زمین پر جم گیا تھا۔ سکھ جین سنگھ کا منہ یوں کھلا تھا۔ جیسے اسے ہچکی آنے والی ہو۔ شاید مرتے سمے اس نے اپنی ماں کو یاد کیا تھا۔ اس کے قریب میجر ہزارا سنگھ زمین پر چت لیٹا تھا۔ گولی اس کی کنپٹی کو چھید کر دماغ کے دوسری طرف نکل گئی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے اپنی جمی ہوئی آنکھوں سے کھلے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حوالدار ٹھاکر سنگھ نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈال کر دیکھا اور چاروں طرف اسے اپنے مُردہ رفیقوں کی لاشیں گھورتی ہوئی ملیں۔ اس کی چوکی پر وہ اکیلا زندہ تھا۔ اور چھٹی پر تھا۔

یکایک ٹھاکر سنگھ میجر ہزارا سنگھ کی لاش کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔

حوالدار ٹھاکر سنگھ اٹین شن۔" اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر خود ہی اٹین شن ہو گیا۔

"سیلیوٹ۔" اس نے اپنے آپ کو حکم دیا۔ اور میجر کی لاش کو سیلوٹ کیا۔ پھر وہ میجر مرحوم کی طرح کڑک کر بولا۔

"حوالدار ٹھاکر سنگھ! آج سے تمہاری چھٹی منسوخ کی جاتی ہے" اور تم کو اس چوکی کا آفیسر کمانڈنگ چیف مقرر کیا جاتا ہے۔ آج سے اس چوکی کی حفاظت تمہارے ذمے ہے۔ اباؤٹ ٹرن۔ ڈسمس۔"

حوالدار ٹھاکر سنگھ نے اتنا کہہ کر سیلیوٹ مارا اباؤٹ ٹرن کیا اور

واپس ہوکر اپنی مشین گن پر بیٹھ گیا۔ اپنی جیب سے اپنے بچے کی تصویر نکال کر دائیں طرف رکھ لی۔ اور اس پر اس پر ایک چھوٹا سا پتھر رکھ دیا تاکہ تصویر نظر آتی رہے اور ہوا کے جھونکے سے اڑ بھی نہ سکے۔ اس نے اپنی مشین کا زاویہ گھماتے ہوئے نیچے گھاٹیوں کی طرف دیکھا جہاں سینکڑوں ہی ہاتھوں میں بندوقیں لئے اس کی چوکی کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے، اور اس کے پاس اسلحہ بہت کم رہ گیا تھا۔

"انھیں اور قریب آنے دو حوالدار ٹھاکر سنگھ۔ اسلحہ ضائع مت کرو۔" ٹھاکر سنگھ نے اپنے آپ سے کہا اور مشین گن کو مضبوطی سے تھام کر انتظار کرنے لگا۔

تین بار اپنے حملے میں ناکام رہنے اور کئی درجن سپاہیوں کو کھونے کے بعد جب سپاہی چوکی نمبر ایک پر پہنچے تو انھیں اپنے چاروں طرف مردے ہی مردے ملے۔ اسلحہ کا آخری راؤنڈ بھی چل چکا تھا اور حوالدار ٹھاکر سنگھ اپنی مشین گن پر مردہ پڑا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کھلی تھیں۔ دونوں ہاتھ پھیلے تھے اور اس کے چہرے پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ تھی۔ حملہ آوروں کا آفیسر دیر تک اسے گھورتا رہا۔ مگر یہ مسکراہٹ اس کی سمجھ میں بالکل نہ آئی کہ کوئی بھی آدمی مرتے سمے کیسے مسکرا سکتا ہے۔ اور پھر یہ مسکراہٹ کچھ عجیب طرح

کی بھی میٹھی بھی اور تلخ بھی۔ کربناک بھی اور تضحیک آمیز بھی۔ جوں جوں وہ اس مسکراہٹ کو دیکھتا جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جاتا ہے جیسے یہ مسکراہٹ اسکا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس نے غصے میں ٹھاکر سنگھ کی پسلی میں زور کی ایک ٹھوکر ماری۔ حوالدار ٹھاکر سنگھ لڑھک کر اپنے بچے کی تصویر پر جا گرا۔ جیسے اس نے اپنے بچے کی تصویر کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہو۔ مگر اس کا چہرہ اب بھی آفیسر کے سامنے تھا اور بدستور مسکرا رہا تھا۔

ٹھاکر سنگھ مردہ تھا۔

مگر اس کی مسکراہٹ زندہ تھی اور ہوا میں ایک جھنڈے کی طرح لہرا رہی تھی۔۔۔ آفیسر نے جیب سے پستول نکالا اور پے در پے کئی گولیاں ٹھاکر سنگھ کے سینے میں داغ دیں۔ بہت سے۔۔۔ سپاہی منہ اٹھا کر حیرت سے اپنے آفیسر کا چہرہ دیکھنے لگے۔ پھر ان کی نگاہیں پلٹ کر مردہ ہندوستانی سپاہی پر جلی گئیں۔ جہاں وہ مسکراہٹ اسی طرح موجود تھی۔ تم ایک آدمی کو مار سکتے ہو لیکن اس کی مسکراہٹ کو نہیں مار سکتے۔ فوجی چوکیوں کو تو بہت سے لوگوں نے فتح کیا ہے۔ لیکن انسان کی مسکراہٹ کو آج تک کس نے فتح کیا ہے۔

۔ ناز ۔

کوکھ کی کونپل

پیگی اور تارا شدید بیزاری کے عالم میں گا رہی تھیں ۔

او کتا

میرا کتا

اور جوتا

میرا جوتا

اور شوہر

میرا شوہر

اور یہ ساحل کی لمبی لکیر ... !

پیگی نے آنکھیں بند کر کے ، پورا منہ کھول کے یوں تلخی سے الاپا ۔ جیسے وہ نغمہ کونین مکسچر بن کر اس کے حلق میں اتر رہا ہو ۔

مکمل بیزاری اور مکمل اکتاہٹ کے عالم میں ساحل کی گیلی ریت میں اوندھی لیٹی کہنیاں ٹکائے ، چہروں کو ہاتھوں کے ہالے میں لئے پیگی البٹن کومب اور تارا چودھری دونوں ایک انگریزی گیت گا رہی تھیں ۔

گیت بیٹ نک (Beatnik) نما بے جاز (JASS) کے موضوع کچھ بھی نہیں!

" او۔ کیا تم نے سوکھا چہرہ دیکھا ہے؟"

" ایسا میرے محبوب کا چہرہ ہے۔!"

" او کیا تم نے شتر مرغ کی چال دیکھی ہے!"

ایسے چلتا ہے، میرا پیارا۔

او کیا تم نے سور کی آواز سنی ہے؟"

ایسے بولتا ہے میر دلبر

مگر

ہائے

اس کا بوسہ!!

......

......

او کتا

میرا کتا

او جوتا

میرا جوتا

او شوہر

میرا شوہر

اور یہ ساحل کی لمبی لکیر ۔ ۔ ۔ ۔ !

ساحل کی لمبی لکیر کو ان دونوں نے اپنے گلے کا زور لگا کر اس طرح کھینچا، کہ آواز واقعی ایک لکیر کی طرح لمبی ہو کر صوت کے افق پر بکھر گئی۔ گیت کا دوسرا بند گا کے وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ چند لمحوں کے لئے انھوں نے ایک دوسرے کو رحم کی نظروں سے دیکھا۔ پھر ان کی نظریں چاہل کے ساحل سے پرے ان ٹیلوں پر پھیلنے لگیں۔ جو تین طرف سے چاہل کے ساحل کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔

نہیں آئے ناں ! بیگی ایش کو مب نے تارا چودھری سے شدید کوفت کے عالم میں پوچھا۔

" اوں ہوں ۔ !" کہہ کر تارا چودھری نے اپنے بریدہ گیسو ہوا میں جھلا دیئے نفی کے انداز میں۔ پھر دونوں کی نگاہیں، دور کے ٹیلوں کو تلاش کر کے واپس آگئیں۔ دونوں کی ٹھوڑیاں گھوم کر ایک دوسرے کے سامنے ہو گئیں۔ پھر دونوں کے ہاتھ اپنے چہرے پر آگئے۔ پھر دونوں نے انتہائی غیض و غضب کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا اور دانت پیس کر گانے لگیں۔

' میرا کتا مر گیا
میرا جوتا گھس گیا۔
میرا شوہر بھاگ گیا۔

اور یہ ساحل کی لمبی لکیر۔ !

اب کے "لکیر" کو انھوں نے اتنے زور سے کھینچا کہ سانس کے کھنچاؤ سے دونوں عورتوں کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ چہرے سرخ ہو کر قرمزی ہو گئے۔ پھر دونوں چکرا کر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے کہنیاں چھوڑ کر ریت پر گر گئیں اور ریت میں منہ چھپا کر سسکنے لگیں۔

دائیں، بائیں چاند کا ساحل دور تک پھیلا ہوا تھا مگر اکیلا تھا۔ دھوپ چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ مگر اکیلی تھی۔ ساحل کی ریت، جنگلی ٹیلوں سے سمندر تک پھیلی ہوئی تھی مگر اکیلی تھی۔ سمندر دانت پیسے ہوئے آتا تھا، اور ساحل سے ٹکرا کر کف اڑاتے ہوئے واپس جاتا ہے۔ دونوں لڑکیاں سمندر سے ذرا دور ریت پر لیٹی تھیں۔ سمندر انھیں چھونا چاہتا تھا۔ مگر چھو نہیں سکتا تھا۔

"اور جو ہمیں چھو سکتے ہیں وہ آتے نہیں۔ !" تارا چودھری نے سمندر کی ناکام کوشش کو شاعرانہ مایوسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ۔ جائیں جہنم میں! پگی ایش کو سب غصے سے بولی اور اس کے پتلے پتلے نتھنے لرزا اٹھے۔ اسکا چہرہ گڑیا کا سا تھا اور کان اتنے چھوٹے تھے کہ سیپ کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پگی کے مقابلے میں تارا چودھری فربہ اندام تھی۔ مگر اس کی فربہی میں ایک عجیب حسن تھا جس کی سطح پر ریشم اور نہوں پر فوم ربڑ کا گمان ہوتا تھا۔ پگی کیلی فورنیا کی رہنے والی تھی اور حسن کے مقابلے میں انتہا کی قدامت پسند تھی۔ سینہ بھرا ہوا۔ اور کولھے بھرے ہوئے کمر بید تیلی۔ باقاعدہ ہر روز کی مالش اور ورزش سے اس نے اپنے حسن کی میزان کو

اس قدر مکمل کر لیا تھا۔ کہ آپ کسی وقت بھی بنک کی میزان کی طرح اس کے آنے پائیاں الگ الگ گِن سکتے تھے۔ بخلاف اس کی "نارا چودہری خود رو شگوفوں سے بھری لچکتی شاخ تھی۔ اور شاخ کبھی اپنے پھول نہیں گنتی۔ !

اپنے خوبصورت جسم کے احساس سے مغلوب ہو کر میگی ایلش کومب نے یکے بعد دیگرے تین شوہروں کو طلاق دی تھی۔ اور نارا چوہدری کو خود اس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ نارا چودہری بڑی بے وقوف تھی اور بھروسہ کرنے والی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے اکسانے پر مسٹر ایلش کومب سے میل ملاقات بڑھائی تھی جو میگی کا شوہر تھا اور نیل کمپنی کا سب سے بڑا مینجر تھا۔ اس آشنائی کا سب سے زیادہ فائدہ مسٹر چودہری کو ہوا جو بہت جلد ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے اس نیل کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر ہو گیا۔ مگر یہ سودا میگی کے لئے بہت مہنگا ثابت ہوا۔ اس نے جل کر اپنے بے وفا شوہر کو طلاق دے دی۔ اور جب مسٹر چودہری اسسٹنٹ مینیجر بن گئے تو انھوں نے اپنی بیوی یعنی "نارا چودہری کو طلاق دے دی۔ کیونکہ کوئی شریف مرد اپنے گھر میں کسی ایسی عورت کو بیوی بنا کر نہیں رکھ سکتا جو بے وفا اور بدچلن ہو۔ بڑی شرمناک بات ہے صاحب! اسی لئے مسٹر چودہری نے "نارا کو طلاق دیکر دوسری شادی کر لی تھی اور جب میگی نے بھی اپنے شوہر کو چھوڑ دیا۔ تو یہ دونوں عورتیں جو اب تک ایک دوسرے کی جانی دشمن تھیں، ایک دوسرے کی عزیز سہیلی بن گئیں۔

اب نارا چودہری (BEGINIKK) بن گئی۔ اور باقاعدہ طور پر میگی کے گروپ میں داخل ہو گئی تھی۔ جو امریکی سینکوں اور بڑی Beatniks

نوجوانوں کے گروپ کی ایک کاربن کاپی تھا۔ یہ لوگ وہی زبان استعمال کرتے تھے۔ وہی محاورے۔ ہاتھ پاؤں کی وہی حرکتیں۔ وہی ناچ وہی گیت، عورتیں مردوں کی طرح بال کٹواتی تھیں اور مردوں نے عورتوں کی طرح لمبے لمبے بال رکھ لئے تھے۔ عورتیں جنیز اور ڈھیلی ڈھالی لمبی شرٹ پہن کر گھومتی تھیں اور مرد منہ میں سلگتے ہوئے پائپ رکھ کر ڈانس کرتے تھے بڑے مزے کی زندگی تھی اسی اثنا میں تارا نے کئی عاشق بدلے، اور نہیں استعمال کرائے اور پگی نے بھی غالباً منہ کا مزہ بدلنے کیلئے ہی کچھ کیا۔ ان دنوں تارا کا دوست، ولیم سٹون میڈ تھا۔ جو تیل کمپنی کا ایک انجینیئر تھا اور پگی ایک ہندوستانی صنعت کار دمن یار کو دل دے بیٹھی تھی۔ ان دونوں نے آج یہاں چاپل کے ساحل پر تارا اور پگی سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

چاپل کا ساحل بمبئی سے بیس میل دور اکیلا الگ تھلگ تنہائی پسند ساحل تھا۔ یہاں نہ تو جوہو کی رونق تھی نہ وارسوا کے مچھیروں کے گیت۔ نہ بھوکے نوجوانوں کی غلیظ نگاہیں، جو گویا عورتوں کے لباس کی تہوں میں گھس کر، ٹٹول ٹٹول کر ایک ایک انگ کا جائزہ لیتے ہیں۔ یوں تو یہ مرد گھر میں بازار میں، اخبار میں، سیاست میں سماج میں، ہر جگہ اونچے اخلاق کا رونا روتے ہیں۔ مگر ان کی نگاہ اس قدر گندی اور غلیظ کیوں ہوتی ہے۔ یہ ایسے اونچے اخلاق کا فائدہ ہی کیا؟ اگر ایک نگاہ بھی ایماندار نہ ملی؟ تارا سوچنے لگی۔

پگی کی نگاہیں ساحل کے پشت پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے سلسلے دوڑنے لگیں۔ جہاں موٹر روڈ آکر ختم ہوتی تھی۔ اور جہاں پگی کی

منفشئی رنگ کی سر سیڈیز کھڑی تھیں۔ آج پیگی نے اپنی موٹر کی رنگ سے ملتا جلتا بکنی سوٹ پہنا تھا جسے پہن کر وہ ایسی لگتی تھی گویا موٹر کمپنی نے موٹر کے ساتھ اسے بھی کسی خراد کی مشین پر ڈھال کر تیار کرایا تھا۔ اس کے جسم کے خطوط اس کی موٹر کے خطوط کی طرح صحیح واضح اور متناسب تھے کہیں پر ایک اِنچ فالتو گوشت اس کے جسم پر نہیں تھا۔ اسکا جسم گویا مردوں کو چیلنج کرتا تھا۔ آؤ کہیں سے چٹکی بھر کے دیکھو۔ اور تارا کے جسم کی گدازیت کہتی تھی۔ ہائے ماں! مجھے مت چھونا۔ میں مرجاؤں گی۔ مجھے گدگدی ہوتی ہے! مغربی مردوں کو تارا کا یوں خوفزدہ ہو جانیکا انداز بہت پسند تھا۔ اور پیگی کم آمیز ہندوستانی مرد بہت پسند تھے۔ مگر پیگی ہنس کر تارا کو بتاتی تھی۔ ارے یہ تمہارے ہندوستانی مرد ڈرائینگ روم میں جس قدر مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں، خلوت میں اتنے ہی بے حیا اور شریر ہوتے ہیں۔ شریر اور ظالم! بالکل ہندو۔ بیسویں صدی کے ہندو۔؟

سب کو جہنم میں بھیجو! تارا غصے سے چلائی۔ سبھی مرد ایک سے ہوتے ہیں صورت کے ہوں یا سان فرانسیکو کے، بمبئی کے ہوں یا بونس ایرز کے، کلکتے کے ہوں یا کراچی کے ہوں۔

اچھا! تم ای لئے ہو کہ تمہارا اسٹون میڈ وعدہ کر کے نہیں آیا۔ پیگی نے انتقامیہ مسرت سے پوچھا۔

"اور تمہارا ولسن پارک کہاں ہے۔؟" تارا جی بھی دھلاتے ہوئے بولی۔

ان دونوں نے دس بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب ساڑھے بارہ

پہنچ رہے تھے۔ اور وہ دونوں نہیں آئے تھے۔ اور وہ دونوں اکیلی تھیں اور ساحل اکیلا تھا۔ اور سمندر اکیلا تھا۔ اور یہ اکیلا پن سوچنے کی دعوت دیتا تھا۔

پیگی سوچ رہی تھی، آ تو جائیں گے وہ۔ ابھی تو نئی نئی دوستی ہے۔ ابھی تو ضرور آئیں گے وہ۔ ابھی تو جی نہیں بھرا۔ مگر دو ماہ بعد کیا ہوگا۔ دس ماہ بعد کیا ہوگا؟ وہی جو ہوتا ہے۔ نگاہیں سرد ہو جائیں گی۔ جذبے مردہ ہو جائیں گے۔ ہر دل سونا اور اداس ہو جائے گا۔ ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ تارا نے سوچا اور اس خواہش ناتمام کا انجام کیا ہے۔ یوں تو میرے پاس سب کچھ ہے۔ ایک گاڑی ہے پہلے سے اچھی ایک فلیٹ ہے۔ پہلے سے عمدہ، لباس ہیں پہلے سے بہتر، عاشق ہیں پہلے سے زیادہ۔ جان چھڑکنے والی زندگی ہے جو پہلے سے زیادہ رنگین مگر کہیں پر کوئی چیز غائب ہے۔ ارے وہ تو کیا ہے جو غائب ہے۔ پیگی نے سوچا، کوئی چھلاوہ۔ کوئی سایہ کوئی موہوم خیال جو وقتی مسرت کے ہر احساس کے پیچھے منڈلاتا رہتا ہے اور خوشیوں کے قہقہوں کے پیچھے خطرے کی گھنٹی بجاتا رہتا ہے ارے کیا نام ہے تیرا؟ تارا نے اپنے دل سے پوچھا۔ کون ہے تو۔ سامنے کیوں نہیں آتا۔ اپنی صورت کیوں نہیں دکھاتا۔ پیچھے کھڑے، کھڑے بے چہرے والے جذبے سامنے آجا۔ تجھے دیکھ لوں۔ تیرے سینے پر سر رکھ کر رو لوں ذرا۔ یکایک تارا نے سسک کر کہا۔ مرد کے لئے عورت ایک عیاشی ہے، لیکن عورت کے لئے تو مرد ایک ضرورت ہے۔

ایک سولھویں صدی کی عورت کی طرح بات کرتی ہو۔ پیگی نے تارا کے گال پر

پیار سے ایک ہلکا سا ہاتھ مار کے کہا۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ سارا قصور ہم عورتوں کا ہے۔ عورتیں ہی بے وفا ہوتی ہیں۔ کیونکہ مرد بے وفا ہوتے ہیں اور مرد اس لئے بے وفا ہوتے ہیں کیونکہ زندگی بے وفا ہوتی ہے اور زندگی اس لئے بے وفا ہوتی ہے کہ موت ناگزیر ہے۔ اس لئے آؤ۔ اس دکھ کے سانپ کو بھول جائیں، جو جنم سے مرن تک ہمارے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے اور ناچیں۔

پیگی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ جو تارا کو اس وقت بڑا کھوکھلا معلوم ہوا۔ پھر پیگی نے اٹھ کر قریب رکھے ہوئے گراموفون پر ایک ریکارڈ رکھ کر اسے چلا دیا۔ اور خود ساحل پر کھڑی ہو کر تارا کو ناچنے کی دعوت دینے لگی۔

"تارا بے دلی سے اٹھی اور اٹھ کر پیگی کے ساتھ ناچنے لگی۔ ریکارڈ ایک جدید ٹوسٹ (Tango) کا تھا۔ جس میں جسم کو اتنے بل کھانے پڑتے ہیں کہ ناچتے ناچتے ہڈیاں تک کڑکڑانے لگتی ہیں۔ ناچ کے پاؤں میں تال کے حساب کتاب ہیں، جسم کی حرکت میں، دل بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ اور وہ منڈلانے والا سایہ دور دور کہیں گم ہونے لگتا ہے۔ مگر پوری طرح پھر بھی گم نہیں ہوتا۔ کسی طرح گم نہیں ہوتا۔ تارا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو ناچ کے بہاؤ میں کھو دیا۔

کچھ عرصے کے بعد جب تارا نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا کہ ایک مراٹھی عورت پہاڑی ٹیلوں کی ایک پگڈنڈی سے اتر کر ریت پر چلتے ہوئے

آرہی ہے۔ اور غالباً دوسری سمت جانے والی پگڈنڈی کو جا رہی ہے۔ چلتے چلتے جب وہ عورت ان کے بہت قریب پہنچی تو تارا نے دیکھا کہ اس عورت کے بال الجھے ہوئے ہیں اور اس کی نوکری مراٹھی ساڑھی کا رنگ ملگجا سا ہو چلا ہے اور اسکا ہرا کھن کا بلاؤز بازو کے قریب سے پھٹ گیا ہے۔ اور اس کے گندمی چہرے پر پسینے کے قطرے ہیں۔ اور وہ بری طرح ہانپ رہی ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے بازوؤں میں ایک نہایت ہی صحت مند، تندرست اور گل گوتھلے سے بچے کو اٹھا رکھا ہے۔ وہ عورت ہانپتے ہانپتے آگے آئی اور پھر تھک کر ریت پر بیٹھ گئیں۔ اور حیرت سے منہ کھولے ہوئے ناچتے ہوئے اپنے سامنے دو عورتوں کو دیکھنے لگی۔

چٹکی بجاتے بجاتے پگی کے ناچ کی لے دھیمی پڑ گئی اور تارا کی بھی۔ اب وہ دونوں صرف ناچ کے تال کا ساتھ دے رہی تھیں۔ مگر ان دونوں کی نظریں اسی دیہاتی عورت پر گڑی تھیں۔

اس دیہاتی عورت نے گھبرا کر اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ کچھ اس طرح سے شرما گئی، جیسے ان دونوں عورتوں کی عریانی سے لجا گئی۔ اس کی لجا دیکھ کر یکایک پگی کو ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کی بھنی سنوٹ اتار پھینکا ہو۔ اس ایک لمحے میں پگی نے اپنے آپ کو اتنا ننگا محسوس کیا تھا جتنا آج تک کسی مرد کی نگاہوں میں ننگا محسوس نہیں کیا تھا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر پگی نے بڑی نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور تیز سے تیز تر ناچنے کی کوشش کرنے لگی۔ پگی کی چٹکی کا اشارہ پا کر تارا نے بھی اپنے قدم تیز کر دیئے۔ مگر دونوں کنکھیوں سے اس عورت کو تکے جا رہی تھیں۔

دیہاتی عورت نے نگاہوں کو پھیر کر اپنے سر کو اچھی طرح ساڑھی سے ڈھک لیا۔ پھر کھسکتے ہوئے آنچل کے کنارے سے اپنے چہرے کے پسینے کو پونچھا۔ اپنی گود میں مچلتے ہوئے بچے کو دیکھا اور ہولے ہولے اپنے بلاؤز کے بٹن کھولنے لگی۔ یکایک پگی ناچتے ناچتے رک گئی۔ اور نارا بھی۔

ہولے ہولے وہ سپید دودھ بھری چھاتی بلاؤز سے یوں باہر نکلی جیسے گہن سے چاند نمودار ہوتا ہے بچہ ہمکنے لگا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلا کر غوں غاں کرتے ہوئے بے قرار ہونے لگا۔ دھیرے سے اطمینان سے اور بغیر کسی جھجک کے اس دیہاتی عورت نے اپنی چھاتی کا منہ بچے کے منہ میں دیدیا اور بچہ ایک خوشی کی دبی ہوئی چیخ سے ماں کی چھاتی سے چمٹ گیا اور چپڑ چپڑ دودھ پینے لگا۔ اور ماں نے سر جھکا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر پیار بھری نگاہ اپنے بچے پر ڈالی اور دوسری نگاہ سر اٹھا کر اپنے سامنے کی دنیا پر یوں ڈالی۔ کہ نارا کو محسوس ہوا جیسے اسی کی نگاہ میں درد کے سارے سمندر سما گئے ہوں اور زندگی کے سارے ساحل اور وہ اندر جانے والے تھے راستے کہیں جاتے ہیں۔ سب سمٹ کر ماں کے سینے میں اتر آئے ہیں اس کی مسکراتی ہوئی نگاہ کو دیکھ کر پگی کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل گئی اور اس نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

دھیرے دھیرے اس دودھ پیتے بچے کے ہاتھ ماں کی چھاتی پر یوں سرک رہے تھے، جیسے کوئی معصوم آرزو اپنی منزل کی طرف سرکتی ہے۔ ان ہاتھوں کو سرکتے دیکھ کر یکایک تارا کو ایسے محسوس ہوا۔ جیسے وہ ہاتھ خود اس کے سینے پر سرک رہے ہیں۔ سرکتے ناف کے اندر جارہے ہیں۔ ٹٹول ٹٹول کر کوکھ،، سے

آگئے اور جینے کا حق مانگ رہے ہیں۔ تارا اک دم چونک کر گھبرا گئی۔ اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور احساس کی حدوں سے دور، دور رہنے والا کوئی سایہ چھلانگ مار کر سامنے آگیا اور تارا نے گھبرا کر پگی کی طرف دیکھا پگی کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر تھے۔

یکایک پگی نے ٹھوکر مار کر ریکارڈ کو توڑ دیا اور گراموفون ایک کھٹاک سے بند ہو گیا۔ فق چہرے والی پگی نے جلدی سے اپنا سامان سمیٹا اور اسے اٹھا کر ساحل کی طرف بھاگی جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ تارا بھی اس کے پیچھے دوڑتی چلی گئی۔ دونوں کی آنکھیں امنڈ امنڈ کر ان کے رخساروں پر بہہ رہی تھیں۔ مگر کسی نے انھیں پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ پگی نے جلدی سے سامان پیچھے موٹر میں پھینک دیا۔ اور پٹ کھول کر آگے سٹیرنگ وہیل پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں تارا بھی آگئی اور پگی کے ساتھ بیٹھ گئی پگی موٹر اسٹارٹ کرنے لگی۔

اتنے میں مخالف سمت سے ایک تیز رفتار موٹر دوڑتی ہوئی آئی اور زور کی بریک لگا کر بالکل قریب آکر رک گئی۔ اس میں سے سٹون میڈ اور رومن پارکھ نمودار ہوئے۔ اور ان دونوں نے پگی اور تارا کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلائے اور چلا کر کہا۔ ہم آگئے۔ ہم آگئے۔

ہم آگئے۔ ہم آگئے۔!

جواب میں بھیگی آنکھوں والی پگی نے اتنے زور سے ایکسیلیٹر دبایا، کہ موٹر تیر کی طرح سنسناتی ہوئی آگے نکل گئی اور ساٹھ ستر میل کی رفتار سے

بمبئی کے راستے پر چلی گئی، اور چند لمحوں میں نظروں سے غائب ہو گئی۔
حیرت سے ومن پارکھ اور سٹون ہیڈ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

٭٭٭

کاک ٹیل

"ایک کاکٹیل اور لو!"

مکئی کے پودے، سوکھ کر سنہرے ہو چکے تھے۔ لانبے لانبے ٹانڈوں پر لانبے لانبے تیز نوکیلے پتے سوکھ کر دونوں طرف یوں جھک گئے تھے جیسے ہوا کے کسی تیز جھونکے سے کسان کی پگڑی کھل جائے۔ پتوں اور ڈنڈوں کے اتصال پر مکئی کے بھٹے سنہری فرغل پہنے، اپنے سر پہ کالے بالوں کی چوٹیاں لہراتے ان دوشیزاؤں کی طرح بے قرار نظر آتے تھے جو میلے جانے کے لئے بیتاب ہوں۔

یکایک ہوا کے لہراتے ہوئے جھونکے نے جھکے ہوئے خشک تنوں کو اٹھالیا انھیں خیمنوں کے لئے ہوا میں جھنڈیوں کی طرح لہرایا۔ سنہری فرغل کانپنے اور کالی چوٹیاں ہوا میں لہرائیں اور فضا میں جوان فصل کا قہقہہ گونج اٹھا۔

یہ قہقہہ جھکیلے جھاگ کے بلبلوں کی طرح دل سے اٹھا اور ایک مسکراہٹ کی طرح بدلو کے چہرے پر کھل گیا۔ وہ فصل سے نگاہ اٹھا کے ندی کے پار دور مغرب کے پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ان پہاڑوں کے افق پر کوئی پھول کھل

رہا ہو۔

بڑھے سانگلو نے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھا اور بول اٹھا:

"بہو کو لے آؤ جا کے۔!"

بدلو نے پوچھا" اور فصل کون کاٹے گا۔"

سانگلو بولا۔ میں ہوں، تیری ماں ہے۔ تیرا چھوٹا بھائی ہے۔ تیری دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ اور ہماری فصل ہے کتنی۔ دو دن میں کٹ جائے گی۔

سانگلو ایک فلاسفر تھا۔ اس نے بڑے غور سے زمین کو پڑھا تھا۔ اور آسمان کو دیکھا تھا، اس لئے وہ فلاسفر ہو چکا تھا۔ اس نے حاکم کی تلوار بھی دیکھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ حاکموں کے نام بدلتے رہتے ہیں لیکن ان کی تلوار نہیں بدلتی۔ اسی لئے اسکا فلسفہ مکی کے پتوں کی طرح خشک سوکھا اور جذبات سے عاری تھا۔

شادی کے بعد موتی اب تک اپنی سسرال نہیں آئی اور اب فصل کٹنے والی ہے۔ اس لئے اسے گھر بلانے کا سبب یہ اچھا موقع ہے موتی پہلی بار اپنی سسرال دیکھے گی اس لئے فراغت کے دنوں میں بلانا اچھا ہے جا کے اسے لے آ!

بدلو کھکھلا کر ہنس پڑا۔ آدمی اس وقت کھکھلا کر ہنستا ہے جب اس کے کان وہی سنیں جو اسکا دل کہتا ہے۔

ایک کاک ٹیل اور لو۔۔۔۔ ڈارلنگ تمہارا نام کیا ہے۔

مغربی پہاڑوں کے ٹانگے سے موتی بدلو کے ہمراہ اپنی سسرال چلی۔ وہ سبز دار پیلے پھولوں والی چھینٹ کی قمیض اور شلوار پہنے ہوئے اپنے رخساروں کے گلاب اور آنکھوں کے نرگسی لئے، اپنی جوانی کی ساری خوشبو اپنے دوپٹے میں سمیٹے ہوئے بدلو کے ساتھ ساتھ چلی۔

اُس کی ماں نے سفر کے لئے ایک پوٹلی میں مکئی کی چار روٹیاں رکھ دیں۔ اور لوکی کا اچار اور پیاز کی دو گٹھیاں اور تھوڑا سا نمک اور چند ہری مرچیں اور بہت سی دعائیں۔ یہ زادِ راہ لے کر موتی بدلو کے سنگ اپنی سُسرال چلی۔

راستے میں موتی نے بدلو سے پوچھا۔ گھر سے گھراٹ کتنی ... دور ہے۔؟"

بدلو کو ندی کے کنارے اپنے گاؤں کی چھوٹی سی چکی کا خیال آیا۔ تمنگ کے پیڑوں کی چھاؤں میں کسی خوبصورت صراحی کی طرح ہر وقت قل قل کرتی ہوئی پن چکی ... اس نے کہا۔

آٹا پیسنے کی چکی ندی کے کنارے ہے۔ ہمارے گھر سے بہت دور نہیں ہے ایک ڈھکی چڑھ کر اور ایک گھاٹی اتر کر بس یوں چٹکی بجاتے آدمی گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا ہے۔"

موتی چپ رہی۔ اسے اپنے گاؤں کے گھراٹ کا خیال آیا۔ بھیڑ کی کھال میں جب وہ دس سیر اناج بھر کر گھراٹ سے آٹا پسوا کر واپس اپنے گھر آتی تھی۔ تو ڈھکی چڑھ کر اسکا سارا بدن کسی تھکی ہوئی گھوڑی کی طرح

کانپنے لگتا تھا۔

مگر میں تمہیں گھڑا ٹ پر نہ جانے دوں گا۔ بدلو نے مونی کا ہاتھ پکڑ کر انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ "گھر میں چکی ہے۔"

مونی کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بدلو کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نرم و نازک بیل کو ایک مضبوط تنا مل گیا ہو۔ جذبات میں ڈولتے ہوئے دونوں دیر تک خاموشی سے چلتے رہے۔

پھر مونی نے پوچھا۔ "اور پانی کا چشمہ کتنی دور ہے۔"

پہاڑی لڑکیوں کو پانی بہت دور سے لانا پڑتا ہے۔ ایک میل دو میل کبھی کبھی تین چار میل کی دوری پر میٹھے پانی کا چشمہ ملتا ہے۔ راستے بھر اور دشوار گزار گھڑے پیاری پیاس حلق میں کانٹے کھاتی ہوئی عورتیں آٹھ دس ٹولیوں میں چشمے سے پانی بھرنے جاتی ہیں۔ خالی گھڑے لے کر جاتے وقت راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ واپسی کے وقت راستے کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ سر پر تین گھڑے رکھ کر جوان عورتیں خچروں کی طرح ہانپنے لگتی ہیں۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔" بدلو نے بے پروائی سے کہا۔ کوئی دو ڈھائی تین میل ہوگا۔"

بالکل اپنے گاؤں کی طرح! مونی نے اپنے دل میں سوچا۔ اور اس کا دل مایوسی سے بیٹھ گیا۔ یہ ہر جگہ پانی گھر سے اتنی دور کیوں ہوتا ہے؟"

پھر

اسے اپنی ماں کی کڑی مشقت کا خیال آیا۔ اب تک وہ خود دن میں دو بار کبھی تین بار چشمے سے لاتی تھی۔ اب گھر بھر کے لئے اس کی غیر حاضری میں اس کی بوڑھی ماں کو پانی ڈھونا پڑے گا۔ اپنی ماں کی تکلیف کا خیال کر کے مونی کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔

مگر بدلو نے اس کے آنسوؤں کا مطلب غلط سمجھا۔ وہ بڑے پیار سے اپنی دلہن کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "مگر میں تمہیں چشمے پر جانے نہ دوں گا۔ میری دو بہنیں ہیں۔ وہ تمہارے حصے کا پانی بھی چشمے سے لے آئیں گی۔"

مونی نے غرور بھری نگاہوں سے بدلو کی طرف دیکھا اور چلتے چلتے رک کر اپنا سر بدلو کے شانے پر رکھ دیا۔

"وہ بڑا پیارا نام ہے تمہارا۔ ایک دفعہ پیرس میں مجھے اسی نام کی ایک لڑکی ملی تھی۔ تم پیرس کبھی گئی ہو۔ پیرس کی کشادہ دلوں اور تنگ کمر والیوں کا شہر ہے۔ لو ایک کاک ٹیل اور۔۔۔۔!"

کھٹے اناروں کے جنگل میں ٹھنڈا گھنا سایہ تھا۔ اور زمین پر ہری ہری دب میں بنفشے کے پھول کھلے ہوتے تھے۔ مونی اور بدلو کو ایک چٹان میں ڈبکا ہوا ایک خرگوش سفید اون کے گولے کی طرح سمٹا ہوا نظر آیا۔ اور وہ دونوں اسے پکڑنے کے لئے بھاگے۔ خرگوش انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے چھلانگ مار کر لپکا اور وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہنستے ہوئے ایک

دوسرے کا ہاتھ جھلاتے ہوئے جنگل کے اندر بھاگے۔ دور تک اندر چلے گئے۔ خرگوش نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر وہ دونوں بھاگتے بھاگتے رک گئے اور مونی نے انتہائی مسرور نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا اور بولی۔

" ہائے کتنا پیارا خرگوش تھا۔ میرا جی اسے گود میں لے کر پیار کرنے کو چاہ رہا تھا۔

" ٹھہر جاؤ۔ بدلو نے اسے شریر نگاہوں سے تاکتے ہوئے کہا۔

" بہت جلد ایسا ہی نرم نرم سفید گول مٹول بچہ تمہاری گود میں کھیلے گا۔

مونی کے رخسار انار کی کلیوں کی طرح شرم سے لال ہو گئے اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور وہیں لجا کر ہری ہری دوب پر بیٹھ گئی اور دوپٹے کا پلو اپنے منہ میں داب کر دیر تک یوں ہنستی رہی جیسے کوئی اس کے سارے جسم میں گدگدی کر رہا ہو۔

یکایک بدلو نے جھک کر مونی کو دونوں ہاتھوں سے ایک گٹھڑی کی طرح اٹھا کر اپنے شانوں پر رکھ لیا اور گاتے ہوئے چلا۔

" دو پتر اناراں دے "

اس کے شانے پر بیٹھی ہوئی مونی نے اپنی لٹکی ہوئی ٹانگیں ہلا ہلا کر جواب دیا۔

کھل گئی خبڈری دن آئے بہاراں دے

ہوتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زیور عورت کے حسن کی آرائش کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ تو کسی دوسرے کے درد کا مداوا ہوتے ہیں شوہر کا آپریشن، بچے کی تعلیم، لڑکی کی شادی، یہ بنیک ایسے ہی موقعوں کے لئے کھلتا ہے اور خالی کر دیا جاتا ہے۔ عورت تو اس زیور کی تحویل دار ہوتی ہے۔ اور زندگی میں مشکل سے پانچ چھ بار اسے اس زیور کو پہننے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

گردے کے دوسرے آپریشن سے پہلے دلاری کا بچہ ضائع ہو گیا وہ ہونا ہی تھا۔ دلاری کو دن رات کڑی مشقت کرنی پڑ رہی تھی۔ اس میں یہ خطرہ سب سے پہلے موجود تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے دلاری کا یہ چھریرا اور سنہرا بدن اس قدر کڑی مشقت کے لئے نہیں بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہ دانا و فرزانہ بچہ بیچ ہی میں سے کہیں سٹک گیا تھا۔ ناسازگار ماحول دیکھ کر اور ماں، باپ کی پتلی حالت کھانپ کر اس نے خود ہی پیدا ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ بعض بچے ایسے عقلمند ہوتے ہیں! دلاری کئی دنوں تک ہسپتال نہیں آسکی اور جب اس نے آکے خبر دی تو وہ کس قدر رو دیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ آگے چل کر اسے اس سے کہیں زیادہ رونا پڑے گا، تو وہ اس حادثے پر رونے کے بجائے خوشی کا اظہار کرتا۔

گردے کے دوسرے آپریشن کے بعد اس کی نوکری جاتی رہی۔ طویل علالت میں یہی ہوتا ہے۔ کوئی کہاں تک انتظار کر سکتا ہے۔ بیماری انسان

کا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ اس لئے اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی نوکری قائم رہے تو اسے زیادہ دیر تک بیمار نہ پڑنا چاہیئے۔ انسان مشین کی طرح ہے۔ اگر ایک مشین طویل عرصے کے لئے بگڑتی رہتی ہے تو اسے اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ نئی مشین آ جاتی ہے۔ کیونکہ کام رک نہیں سکتا۔ بزنس بند نہیں ہو سکتا اور وقت تھم نہیں سکتا۔ اس لئے جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی نوکری جاتی ہے تو اسے شدید دھچکا لگا۔ جیسے اسکا دوسرا گردہ بھی نکال لیا گیا ہے۔ اس دھچکے سے اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ اصلی اور بڑی مصیبت میں آنسو بھی نہیں آتے۔

صرف دل کے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ زمین قدموں کے نیچے سے کھسکتی معلوم ہوتی ہے اور رگوں میں خون کے بجائے خوف دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کئی دن تک وہ آنے والی زندگی کے خوف اور دہشت سے سو نہیں سکا تھا۔ طویل علالت کے خرچے بھی طویل ہوتے ہیں اور زیر بار کرنے والے ہوتے ہوئے گھر کی قیمتی چیزیں چلی گئیں۔ مگر دلاری نے ہمت نہیں ہاری اس نے ساڑھے چار ماہ تک اپنے شوہر کو پرائیویٹ وارڈ میں رکھا۔ اسکا بہترین علاج کیا۔ اپنے گھر کی ایک ایک چیز بیچ دی اور آخر میں نوکری بھی کر لی۔ وہ ایک فرم میں ملازم ہو گئی تھی۔ اور ایک روز اپنی فرم کے مالک کو لے کر ہسپتال بھی آئی تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا، کوتاہ قد، ادھیڑ عمر کا شرمیلا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ کم گو، اور میٹھی مسکراہٹ والا۔ صورت شکل سے

وہ کسی بڑی فرم کا مالک ہونے کے بجائے کتابوں کی کسی دوکان کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ دلاری اس فرم میں دوسو روپے مہینے پر نوکر ہوگئی تھی، چونکہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، اس لئے اس کا کام لفافوں پر ٹکٹیں لگانا تھا۔

"یہ تو بہت آسان کام ہے۔" دلاری کے شوہر نے کہا۔

فرم کا باس بولا۔

"کام تو آسان ہے، مگر جب دن میں پانچ چھ سو خطوں پر ٹکٹیں لگانا پڑیں تو اسی طرح کا بہت آسان کام بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔!"

دلاری نے مسکرا کر کہا۔ "واقعی بہت تھک جاتی ہوں۔!"

اور فرم کے باس نے اس سے کہا، اچھے ہو جاؤ تو تم اپنی بیوی کے بجائے ٹکٹیں لگایا کرنا۔ میں یہ کام تمہیں سونپ دوں گا۔!"

جب فرم کا باس جانے لگا تو دلاری بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج دلاری کے قدموں کی چاپ میں ایک عجیب خود اعتمادی سی ہے۔ اسکا جسم کسی پھولدار شاخ کی طرح لچک رہا ہے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے باس نے دلاری کے لئے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر مودب ہو کر دلاری کو دروازے سے باہر جانے کی دعوت دیتے ہوئے ذرا سا جھکا اور ایک لمحہ کے لئے اسکا دوسرا ہاتھ دلاری کی کمر پر ایک ثانیئے کے لئے رکا۔ اور دلاری کے شوہر تو فرم کے باس کے پہلے ہاتھ کی حرکت تو پسند آئی لیکن پھر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ کبھی کبھی ایک ہاتھ جو کرتا ہے وہ دوسرے ہاتھ کو معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

اس کی آنکھوں کو دھوکہ ہوا ہو۔ محض ایک واہمہ اس لئے اس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور نرم تکیوں پر سر ٹکا کر گلوکوز کے انجکشن کا انتظار کرنے لگا۔

اس کا تیسرا آپریشن ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ہوا تھا۔ اس وقت تک دلاری فرم کے باس کے ساتھ وارجلنگ جا چکی تھی۔ آخر کوئی کب تک صبر کرسکتا ہے زندگی مختصر ہے اور زندگی کی بہار اس سے کہیں مختصر ہوتی ہے جب جذبے سے بلاتے ہیں اور آنکھوں میں چاند اترنے آتے ہیں۔ جب انگلیوں میں شعلوں کا سا لمس محسوس ہوتا ہے اور سینے میں میٹھا میٹھا سا درد ہوتا ہے جب بوسے بھونرے کی طرح لبوں کی پنکھڑیوں پر گرتے ہیں اور گردن طرح دار خم کی کسی کی گرم گرم سانس کی مدھم مدھم آنچ کو ترستے ہیں۔ ایسے میں کوئی کب تک فینائل اور پیشاب کی بو سونگھے تھوک اور پیپ اور لہو کا رنگ دیکھے اور موت کے دروازے تک جاتی ہے اور لوٹ کر آئی ہوئی سسکیاں سنے؟ آخر قوت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور بیس بیس برس کی لڑکی کی قوت برداشت بھی کیا؟ جس کی شادی کو ابھی دو سال بھی نہ ہوتے تھے۔ اور جس نے اپنے شوہر کے ساتھ مصیبتوں کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ اگر اپنے سپنوں کی ڈور سے بندھی بندھی دارجلنگ چلی جاتے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟

اور وہ اس منزل سے گزر چکا تھا۔ جب وہ کسی کو قصور وار ٹھہرا سکتا تھا۔ اتنی چوٹیں اس پر پے در پے پڑی تھیں کہ وہ بالکل بھول گیا۔ بالکل سناٹے میں آگیا۔ وہ بالکل دم بخود تھا۔ اب اس کی مصیبت اور ذکلیف میں کسی طرح کا

کوئی جذبہ یا آنسو نہ رہ گیا تھا۔ بار بار ہتھوڑے کی ضربیں کھا کھا کر اسکا دل دھات کے ایک پترے کی طرح بے بس ہو گیا۔ اسی لئے آج جب اسے ہسپتال سے نکالا تو اس نے ڈاکٹر سے کسی تکلیف کی شکایت نہیں کی تھی اس نے اس سے یہ نہیں کہا تھا۔ کہ اب وہ اس ہسپتال سے نکل کر کہاں جائے؟ اب اسکا کوئی گھر نہیں تھا، اس کی جیب خالی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک خالی اور سپاٹ مستقبل تھا۔

مگر اس نے یہ سب نہیں کہا تھا۔ اس نے صرف یہ کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب، مجھ سے چلا نہیں جاتا۔!"

بس یہی ایک حقیقت تھی جو اسے اس وقت یاد تھی، باقی ہر بات اس کے دل سے محو ہو چکی تھی۔ اس وقت چلتے چلتے وہ صرف یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کا جسم گیلی روئی کا بنا ہوا ہے اس کی ریڑھ کی ہڈی کسی پرانی شکستہ چارپائی کی طرح چیخ رہی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ روشنی نشتر کی طرح چبھتی ہے۔ آسمان پر ایک میلے اور پیلے رنگ کا وارنش پھرا ہوا ہے اور فضا میں تاریک ترمرے اور چٹیاں سی غلیظ مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی ہیں۔ اور لوگوں کی نگاہیں بھی کہ گندلے لہو، اور پیپ کی طرح اس کے جسم سے چپچپا کر رہ جاتی ہیں اسے بھاگ جانا چاہیئے۔ کہیں پر ان کے کھمبے الجھے بجلی کے تاروں والے کھمبوں اور ان کے درمیان گڈمڈ ہونے والو راستوں سے کہیں دور بھاگ جانا چاہیئے، اور اسے اپنی ماں کی یاد آئی جو مر چکی تھی۔ اپنا باپ یاد آیا جو مر چکا تھا۔ اپنا بھائی یاد آیا جو افریقہ میں تھا۔ سن سن سن ایک ٹرام اس کے قریب سے گزرے گی۔ ٹرام کی

ٹرق چھڑی بجلی کے تار سے گھستی ہوئی گیا اس کے جسم کے اندر گھستی چلی جارہی تھی۔ وہ پوری ٹرام کو اپنے جسم کے اندر چلتا ہوا محسوس کر سکتا تھا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی انسان نہیں ہے۔ ایک گھسا پٹا راستہ ہے!

دیر تک وہ چلتا رہا۔ ہانپتا رہا اور چلتا رہا۔ اندازے سے ایک موہوم سمت کو چلتا رہا۔ جدھر کبھی اسکا گھر تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اب اس کا وہاں کوئی گھر نہیں ہے۔ مگر وہ جانتے ہوئے بھی ادھر ہی چلتا رہا۔ گھر جانے کی عادت سے مجبور ہو کر۔ مگر دھوپ بہت تیز تھی اور اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور وہ راستہ بھول گیا اور اب اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ کہ وہ کسی مسافر سے راستہ ہی پوچھ لے معلوم کرلے۔ یہ شہر کا کونسا حصّہ ہے۔ ہولے ہولے اس کے کانوں میں ٹراموں اور بسوں کا شور بڑھنے لگا۔ نگاہوں میں دیواریں ٹیڑھی ہونے لگیں۔ عمارتیں گرنے لگیں۔ بجلی کے کھمبے گڈمڈ ہونے لگے۔ پھر اس کی آنکھوں تلے اندھیرا اور قدموں تلے ایک بھونچال سا آیا اور وہ یکایک زمین پر گر پڑا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو رات ہو چکی تھی۔ ایک نیم خنک سا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جس جگہ پر وہ گرا تھا۔ اب تک وہ وہیں لیٹا ہوا ہے۔ یہ فٹ پاتھ ایک ایسا موڑ تھا۔ جس کے عقب میں دو طرفہ دو دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار فٹ پاتھ سے لگی سیدھی شمال

سے جنوب کو چلی گئی تھی۔ دوسری شمال سے مغرب کو، اور وہ دونوں دیوار وں کے اتصال پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں دیواریں کوئی چار فٹ کے قریب بلند تھیں اور ان کے پیچھے امرود اور جامن کے پیڑ تھے۔ اور ان پیڑوں کے پیچھے کیا تھا۔ وہ اسے اس وقت نظر نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف مغربی دیوار کے سامنے پچیس تیس فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر ایک پرانی عمارت کا عقب تھا۔ سہ منزلہ عمارت تھی اور ہر منزل میں پیچھے کی طرف صرف ایک کھڑکی تھی اور جیسے بڑے بڑے عقبی پائپ تھے۔ عقبی پائپ اور مغربی دیوار کے بیچ میں پچیس تیس فٹ چوڑی ایک اندھی گلی بن گئی تھی، جس کے تین طرف سڑک تھی۔ کہیں دور کسی گرجے کے گھنٹے نے رات کے تین بجائے، اور وہ فٹ پاتھ پر لیٹا لیٹا اپنی کہنیوں پر زور دے کر ذرا سا اوپر اٹھا، اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ سامنے کی دکانیں بند تھیں اور فٹ پاتھ کے اندھے سایوں میں کہیں کہیں بجلی کے کمزور بلب جھلملا رہے تھے۔ چند لمحوں کے لئے اسے یہ ٹھنڈی تاریکی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ چند لمحوں کے لئے اس نے اپنی آنکھوں بند کر کے سوچا۔ شاید وہ کسی مہربان سمندر کے پانیوں میں ڈوب رہا ہے۔

مگر اس کو احساس ہے۔ اپنے آپ کو صرف چند لمحوں تک خوشگوار خنکی کے بعد اس نے محسوس کر لیا کہ وہ شدید طور پر بھوکا ہے۔ جب سے اس کی آنتوں کا آپریشن ہوا تھا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس نے سوچا کہ

ڈاکٹروں نے اس کی آنتوں کے فعل کو بیدار کر کے اس کے ساتھ کسی طرح کی بھلائی نہیں کی ہے۔ اس کے معدے کے اندر عجیب اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ اور آنتیں اندر ہی اندر تڑپ تڑپ کر روٹی کا سوال کر رہی تھیں اور اس وقت اس کے نتھنے کسی شہری انسان کے نتھنوں کی طرح نہیں بلکہ کسی جنگلی جانور کے نتھنوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ عجیب سی بوئیں اس کی ناک میں آ رہی تھیں۔ بوؤں کی ایک سمفنی تھی جو اس کے احساس پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس سمفنی کے ایک سر کا الگ الگ وجود پہچان سکتا تھا۔ یہ جامن کی خوشبو ہے یہ امرود کی یہ رات کی رانی کے پھولوں کی یہ تیل میں تلی ہوئی پوریوں کی۔ یہ پیاز اور لہسن میں بگھارے ہوئے آلوؤں کی، یہ مولی کی، یہ ٹماٹر کی، یہ کسی سڑے ہوئے پھل، یہ پیشاب کی، یہ پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی جو غالباً بانسوں کے جھنڈ سے آ رہی تھی۔ وہ ہر بو کی نوعیت، شدت سمت اور فاصلے تک کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یکایک اسے یہ احساس بھی ہوا اور وہ اس بات پر چونکا بھی کہ کس طرح بھوک نے اس کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ مگر اس پر زیادہ غور کئے بغیر اس نے اس طرف گھسٹنا شروع کر دیا۔ جدھر سے اسے تیل میں تلی پوریوں اور لہسن سے بگھارے ہوئے آلوؤں کی بو آئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اندھی گلی کے اندر گھسٹنے لگا۔ کیونکہ وہ اپنے جسم میں چلنے کی سکت بالکل نہیں پاتا ہے۔ ہر لحاظ اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی دھوبی اس کی آنتوں کو سکیڑ کر مروڑ رہا ہے پھر اس کے نتھنے میں پوریوں اور آلو کی اشتہا آمیز بو آتی اور وہ بے قرار ہو کر

"تمہارے ہونٹ کسی اجنبی کا خط معلوم ہوتے ہیں انھیں کھولنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کاک ٹیل میرے ہاتھ سے پیئو!"

رنگ پور کی گھاٹی طے کرکے ساگرہ کی وادی سے گزر کر جب وہ کھیڑا گلی کے درّے پر پہنچے جہاں ٹھنڈے پانی کا چشمہ درّے کی اونچی چٹانوں کے بیچ سے نکل کر بہتا ہے۔ اور قریب ہی چیڑھوں کا ایک جھنڈ تھا سورج نصف النہار پر آچکا تھا۔

بدلو نے اس کو چشمے کے کنارے اتار دیا۔ اور چیڑھ کے سوکھے چھوروں کو پھیلا کر ان پر کھانے کی پوٹلی کھولی اور مونی کے آگے بڑھا دی۔ مونی نے شرما کر بدلو کے آگے سرکا دی۔ ... بدلو نے جھجک کر مکئی کی روٹی کا ایک ٹکڑا توڑا۔ لوکی کے اچار کا ایک ٹکڑا اس کے اندر رکھا اور اپنا ہاتھ مونی کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ مونی نے شرما کر اپنا منہ نیچے کرلیا۔ وہ جدھر جدھر اپنا منہ پھیرتی جاتی بدلو کا ہاتھ ادھر ہی ادھر بڑھتا جاتا۔ آخر مونی نے مکئی کی روٹی کا وہ ٹکڑا اپنے دانتوں میں داب لیا اور ساتھ میں بدلو کی انگلی بھی۔

"سی!" بدلو نے آہستہ سے کہا۔

گہری خوابناک نگاہوں سے بدلو کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے مونی نے بدلو کی انگلی چھوڑ دی اور ہولے ہولے مکی کا ٹکڑا کھانے لگی۔ کھاتے کھاتے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مکئی کا ٹکڑا نہیں کھا رہی ہے۔ کسی شہد بھرے

چھیتے کا موتی ٹکڑ چبا رہی ہے۔

وہ سامنے دیکھو میرا گاؤں!'' بدلو نے ذرے کی اونچائی سے نیچے اترتی ہوئی گھاٹیوں سے پرے دھان کے کھیتوں سے پرے پہاڑی ڈھلکی پر آباد گاؤں کو دور سے دکھایا، جس کے ارد گرد مکئی کے کھیت سیڑھیوں کی طرح بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

موتی کا دل دھک سے رہ گیا۔ حیرت انگیز اور جھنپے سے اسکا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ موقع دیکھ کر بدلو نے اس کے کھلے منہ میں مکئی کی روٹی کا دوسرا ٹکڑا ڈال دیا۔

"یہ چکن چاٹ کھاؤ ڈارلنگ! یہ مرغ کے سفید گوشت کے باریک ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا مسالہ ڈالا گیا ہے۔ یہ چکن چاٹ اس ہوٹل کی خاص چیز ہے۔ ذرا چکھ کے تو دیکھو جب تک میں تمہارے لئے ایک اور کاک ٹیل بناتا ہوں۔

گھاٹیاں اترتے اترتے جب وہ ندی کے کنارے پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی، سورج اپنا سارا سونا سمیٹ کر مغرب میں جا چھپا تھا۔ رات کے اندھیرے میں دور اوپر ڈھلکی پر آباد گاؤں میں کہیں کہیں روشن چراغ جگنوؤں کی طرح چمکتے نظر آتے تھے۔ ہوا میں ایک برفیلی خنکی آ چکی تھی اور موتی رہ رہ کر سردی سے کانپ جاتی تھی۔

بدلو نے اپنی چادر بھی اتار کر موتی کو اڑھا دی۔ اور موتی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی دوسری چادر کے اندر نہیں ہے، بلکہ اپنے خاوند کے مضبوط بازوؤں میں ہے۔ ندی پار کر کے دھان کے کھیتوں میں سرسراتی ہوئی باسمتی کے چاولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں تیرنے لگی۔ ڈھکی چڑھتے چڑھتے اس کے کانوں میں بچوں کی آوازیں آنے لگیں۔ عورتوں کی ہنسی، مردوں کی سنجیدہ گفتگو، کہیں بزرگوں کا نغمہ، کہیں سے ہانڈی میں بگھرے ہوئے سالن کی خوشبو۔ نرم نرم آوازوں اور خوشبوؤں سے اسکا دل مہک اٹھا اور اس کی بھوک تیز ہو گئی۔

رات کی تاریکی میں انھیں راستہ میں کوئی نہ ملا۔ ایک گلی میں سے گزر کر وہ ایک اونچے ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے، جہاں ناشپاتیوں کے چند راز دار دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑ کر کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ موتی کان لگا کر سننا چاہا۔ مگر سرائے ہوئے پتوں کی سائیں سائیں کے سوا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

بدلو نے ٹیلے کے نیچے کھڑے افق کی طرف دیکھ کر کہا "کچھ دیر میں چاند نکلا چاہتا ہے۔"

"آگے بڑھو۔" موتی نے سرگوشی میں بدلو سے کہا۔

اس ٹیلے کے آگے ہمارے کھیت ہیں،" بدلو نے غرور بھرے لہجے میں کہا۔ اور کھیتوں سے آگے میرا گھر ہے، تمہارا گھر!

یہ سنتے موتی نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

نہیں نہیں میں آگے نہیں جاؤں گی۔"

بدلو نے ہنس کر کہا۔" آگے نہیں جاؤ گی تو کہاں جاؤں گی۔؟ آگے ہی تمہارا گھر ہے۔ آگے ہی تو تمہارے کھیت ہیں۔ میرے باپ نے فصل کاٹ کے کھلیان لگا دیا ہوگا۔ ذرا چاند نکل آئے تو آگے چلیں گے۔

چاند کا انتظار کیوں۔؟ مونی نے پوچھا۔

" میں چاہتا ہوں کہ جب چاندنی کھل جائے تو میں اپنا کھلیان دیکھوں اور میرے گھر والے اپنی دلہن کا چاند سا منہ دیکھیں۔"

ہائے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ مونی کانپتے ہوئے الجا کر بدلو کے شانے سے لگ گئی۔ اتنے میں کہیں سے ایک کتا بھاگ کر آیا اور مونی کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔ مونی بدلو سے چمٹ گئی۔ بدلو نے کتے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ارے جیرے کیا ہوا تجھ کو پہچانتے نہیں ہو۔ پھر اتنا کہہ کر بدلو مونی سے مخاطب ہوا۔ یہ جیرا ہے۔ میرا کتا۔!

جیرا دونوں کو سونگھ کر دم ہلانے لگا اور خوشی سے ان کے گرد ناچنے لگا۔ پھر جہاں پر زمین اور آسمان ہونٹوں کی طرح ملتے ہیں، وہاں پر چاند ایک مسکراہٹ کی طرح نمودار ہوا اور بدلو نے خوشی اور خوف یاس اور امید میں ڈوبی ہوئی مونی کی حیران آنکھوں کی ڈولتی ہوئی پتلیوں کو دیکھا اور ایک پرحسرت احساس اور گہرے اعتماد سے اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹیلے کی طرف لے گیا، جہاں اس کے کھیت تھے اور کھیتوں سے پرے اسکا گھر تھا۔

ٹیلے کے دوسری جانب جاکر چھٹکی ہوئی چاندنی میں وہ چند لمحے بھونچکا کھڑا رہا۔

حدِ نگاہ تک، گھر کے دروازے تک، کھیتوں سے فصل کٹ چکی تھی۔ مکئی کے پودوں کے بجائے کھیتوں میں صرف ان کے ٹھٹھ باقی رہ گئے تھے۔ ورنہ ساری فصل میٹ لی گئی تھی۔ مگر کھیتوں میں کہیں پر کوئی کھلیان نظر نہیں آتا تھا۔

بدلو نے آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا، مگر اسے کہیں پر مکی کا ایک پودا تک نظر نہ آیا۔

پھر اس کی آنکھوں نے گھر کے دروازے پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے اپنے باپ سانگلو کو دیکھا۔ اور وہ مونی کو وہیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا اپنے باپ کی طرف بھاگا۔

"کھلیان کہاں ہے؟" اس نے دہشت سے چلا کر پوچھا۔

"بنیا لے گیا۔"

"سب؟" بدلو غصے اور مایوسی سے چیخا۔

"سب"

"کچھ نہیں چھوڑا؟" گہری مایوسی سے بدلو کا دل بیٹھنے لگا۔

"ایک دانہ تک نہیں چھوڑا!" سانگلو نے ہوا کی سرگوشی سے بھی آہستہ لہجے میں کہا اور سر جھکا لیا۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور گھر کے اندر چلا گیا۔

ہوئے ہوئے سے مونی بدلو کے پاس آگئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھر کی دہلیز پر بیٹھ گئے اور سامنے کے ویران اور اجاڑ کھیتوں میں مکئی کے ٹھنٹھ دیکھنے لگے جو قطار در قطار سینکڑوں چیلوں کی طرح حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔

انھیں دیکھ کر مونی بڑی بے لبسی سے رونے لگی اور سسک سسک کر کہنے لگی " مجھے بھوک لگی ہے۔!"

"کیا بات ہے مونی؟ رو رہی ہو؟ ڈارلنگ کیا ہوا تم کو؟ کچھ یاد آرہا ہے؟ ٹھہرو میں یہ کھڑکی کھولے دیتا ہوں۔ تم اس پھولوں سے سجے ہوئے بستر پر لیٹ جاؤ اور کھڑکی سے چھنتی ہوئی چاندنی میں سمندر کا نظارہ دیکھو۔ جب تک میں تمہارے لئے ایک کاک ٹیل اور . . . . !"

-ا ر-

کچرا بابا

جب وہ ہسپتال سے باہر نکلا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور اسکا سارا جسم بھیگی ہوئی روئی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اسکا جی چلنے کو نہیں چاہتا تھا، وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ جانے کو چاہتا تھا۔

قاعدے سے اسے ابھی ایک ماہ ہسپتال میں رہنا چاہیئے تھا۔ مگر ہسپتال والوں نے اس کی چھٹی کر دی تھی۔ ساڑھے چار ماہ تک وہ ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں رہا تھا۔ اور ڈیڑھ ماہ تک جنرل وارڈ میں۔ اس اثنا میں اسکا ایک گردہ نکال دیا گیا تھا اور اس کی آنتوں کا ایک حصہ کاٹ کے آنتوں کے فعل کو درست کیا گیا تھا۔ ابھی اس کے کلیجے کا فعل درست نہیں ہوا تھا کہ اسے ہسپتال سے نکل جانا پڑا، کیونکہ دوسرے لوگ انتظار کر رہے تھے جن کی اس سے بھی بدتر حالت تھی۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا نسخہ دیدیا اور کہا۔
"یہ ٹانک پیو اور مقوی غذا کھاؤ۔ بالکل تندرست ہو جاؤ گے۔
"اب ہسپتال میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔!"
مگر مجھ سے چلا نہیں جاتا، ڈاکٹر صاحب" اس نے کمزور آواز میں احتجاج کیا۔
گھر جاؤ، چند دن بیوی خدمت کریگی۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"
بہت ہی دھیرے دھیرے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے سوچا، گھر؟ مگر میرا گھر ہے کہاں؟
چند ماں پہلے میرا ایک گھر ضرور تھا۔ ایک بیوی بھی جس کے ایک بچہ ہونے والا تھا۔ وہ دونوں اس آنے والے بچے کے تصور سے کس قدر خوش تھے۔ ہوگی دنیا میں زیادہ آبادی، مگر وہ تو ان دونوں کا پہلا بچہ تھا۔ اور ان کی حیرت اور مسرت سے معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ بچہ دنیا کا سب سے پہلا بچہ ہونے جا رہا ہے۔
دلاری نے اپنے ... بچے کے لئے بڑے خوبصورت کپڑے سیئے تھے اور ہسپتال میں لاکر اسے دکھائے تھے۔ اور ان کپڑوں کی نرم سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ اپنے بچے کو بانہوں میں لے کر اس سے پیار کر رہا ہے۔
مگر پھر اگلے چند مہینوں میں بہت کچھ لٹ گیا۔ جب اس کے گردے کا پہلا آپریشن ہوا تو دلاری نے اپنے زیور بیچ دیئے کہ ایسے ہی موقعوں کے لئے

نیم مندھی آنکھوں سے اپنے نفرت بھرے جان سے جسم کو ادھر گھسیٹنے کی کوشش کرتا۔ جدھر سے آلو پوری کی بو آرہی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد جب وہ اس جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مغربی دیوار اور اس کے سامنے کی عمارت کے پچھواڑے کے پائپوں کے درمیان پچیس تیس فٹ کے فاصلے میں مستطیل نما کچرے کا ایک بہت بڑا کھلا آہنی ٹب رکھا ہے یہ ٹب کوئی پندرہ فٹ چوڑا ہوگا اور تیس فٹ لمبا۔ اور اس میں طرح طرح کا کوڑا کرکٹ بھرا ہے۔ گلے سڑے پھلوں کے چھلکے اور ڈبل روٹیوں کے غلیظ ٹکڑے اور چائے کی پتیا اور ایک پرانی جیکٹ اور بچوں کے گندے پوتڑے اور انڈے چھلکے اور کھیرے کے ٹکڑے اور رسالوں کے پھٹے اوراق اور ردی کے ٹکڑے اور لوہے کی ٹونٹیاں اور پلاسٹک کے ٹوٹے ہوئے کھلونے اور مٹر کے چھلکے اور پودینے کے پتے اور کیلے کی تیل پر چند آدھ کھائی بوٹیاں اور آلو کی بھاجی، پوریوں اور آلو کی بھاجی کو دیکھ کر گویا اس کی آنتیں ابل پڑیں۔ اس نے چند لمحوں کے لئے اپنے بیقرار ہاتھ روک لئے۔ مگر دوسری بدبوؤں کے مقابلے میں اس کے نتھنوں میں اگلے چند ثانیوں تک پوری اور بھاجی کی اشتہا آمیز خوشبو اسی طرح تیز تر ہوتی گئی جیسے کسی سمفنی میں یکایک کوئی خاص سُر اک دم ہو جاتے ہیں۔ اور یکایک تہذیب کی آخری دیواریں ڈھے گئیں اور اس کے کانپتے ہوئے بے قرار ہاتھوں نے کیلے کے اس تیل کو دبوچ لیا اور وہ ایک وحشیانہ گرسنگی سے متاثر ہو کر ان پوریوں پر ٹوٹ پڑا۔ پوری بھاجی کھا کے اس نے کیلے کے پتے کو چاہ

بار چاٹا اور اسے ایسے شفاف کر کے چھوڑ دیا۔ جیسے قدرت نے اسے بنایا تھا۔ تیل چاٹنے کے بعد اس نے اپنی انگلیاں چاٹیں اور لمبے لمبے ناخنوں میں بھری ہوئی آلو کی بھاجی زبان کی نوک سے نکال کر کھائی۔ اور جب اس سے بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر کوڑے کے ڈھیر کو کھنگھولتے ہوئے اس میں سے پودینے کے پتے نکال کر کھائے اور مولی کے دو ٹکڑے اور ایک آدھا ٹماٹر اپنے منہ میں ڈال کر مزے سے اسکا رس پیا۔ اور جب وہ سب کچھ کھا چکا تو اس کے سارے جسم میں نیم غنودگی کی ایک لہر سی اٹھی اور وہ وہیں ٹب کے کنارے گر کر سو گیا۔

آٹھ دس روز اسی نیم غنودگی اور نیم بے ہوشی کی حالت میں گزرے وہ گھسٹ گھسٹ کر ٹب کے قریب جاتا اور جو کھانے کو ملتا کھا لیتا اور جب اشتہا آمیز بوؤں کی تسکین ہو جاتی اور دوسری گندی بوئیں ابھرنے لگتیں۔ تو وہ گھسٹ گھسٹ کر ٹب سے پرے فٹ پاتھ کے نکڑ پر چلا جاتا اور عقبی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا یا سو جاتا۔

پندرہ بیس روز کے بعد ہولے ہولے اس کے جسم میں طاقت ابھرنے لگی۔ ہولے ہولے وہ اپنے ماحول سے مانوس ہونے لگا۔ یہ جگہ کتنی اچھی تھی یہاں دھوپ نہیں تھی۔ یہاں درختوں کا سایہ تھا۔ آندھی گلی سنسان اور ویران تھی۔ یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ کبھی عقبی عمارت سے کوئی کھڑکی کھلتی تھی اور کوئی ہاتھ پھیلا کر نیچے کے ٹب میں روز مرہ کا کوڑا پھینک دیتا۔ یہ کوڑا اجلاس کا روزی رساں تھا۔ اس کے شب و روز کا رزاق

تھا۔ اس کی زندگی کا محافظ تھا۔ دن میں سڑک چلتی تھی۔ دوکانیں کھلتی تھیں لوگ باگ گھومتے تھے۔ بچے ابابیلوں کی طرح چہکتے ہوئے سڑک سے گزر جاتے تھے۔ عورتیں پتنگوں کی طرح ڈولتی ہوئی گزر جاتی تھیں لیکن ایک دوسری دنیا تھی۔ اس دنیا سے اسکا کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس دنیا میں اب اس کا کوئی نہ تھا۔ اور وہ کسی کا نہ تھا۔ اس دنیا سے اسے نفرت تھی اور اس دنیا سے اس نے منہ موڑ لیا تھا۔ شہر کی گلیاں اور بازار اور سڑکیں اس کے لئے موہوم سائے بن گئے۔ اور اس سے باہر کے میدان اور کھیت اور کھلا آسمان ایک بے معنی تصور، گھر، کام کاج، زندگی، سماج، جد وجہد بے معنی الفاظ جو گل سڑ کر اس کوڑے، کچرے کے ڈھیر میں مل کر سخت مربوط ہو گئے تھے۔ اس دنیا سے اس نے منہ موڑ لیا تھا۔ اور اب یہی اس کی دنیا تھی۔ پندرہ فٹ لمبی اور تیس فٹ چوڑی۔

ماہ و سال گزرتے گئے اور وہ اس ٹکڑ پر بیٹھا بیٹھا ایک پرانے ٹھنٹھ کی طرح یا کسی پرانی یادگار کی طرح سب کی نظروں میں مانوس ہوتا گیا۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ کسی کو فیض نہیں پہنچاتا تھا کسی سے بھیک نہیں مانگتا تھا۔ لیکن اگر وہ کسی دن وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا تو اس علاقہ کے ہر فرد کو اس امر پر حیرت ہوتی اور شاید کسی قدر تکلیف بھی ہوتی۔

سب لوگ اسے کچرا بابا کہتے تھے۔ کیونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ وہ

صرف کچرے کے ٹب میں سے اپنی خوراک نکال کے کھاتا ہے اور جس دن اسے وہاں سے کچھ نہ ملتا وہ بھوکا ہی سو جاتا تھا۔ برسوں سے راہ گیر اور ایرانی رستوران والے اس کی عادت کو پہچان گئے تھے اور اکثر انھیں جو کچھ ڈالنا ہوتا اس کے لئے وہ اسے کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیتے تھے اور اکثر عمارت کی عقبی کھڑکیوں سے اب کوڑے، کچرے کے علاوہ خورد و نوش کی دوسری چیزیں بھی پھینکی جاتیں۔ صحیح و سالم پوریاں، اور بہت سی بھاجی اور گوشت کے ٹکڑے اور آدھے چوسے ہوئے آم اور چٹنی اور کباب کے ٹکڑے اور کھیر میں لتھڑے ہوئے تیل، ناؤ و نوش کی یہ نعمت کچرا بابا کو اس ٹب میں سے مل جاتی تھی، کبھی کبھی کوئی پھٹا ہوا پاجامہ، کوئی ادھڑی ہوئی شیروانی، کوئی تار تار شکستہ قمیض، پلاسٹک کا گلاس، یہ کچرے کا ٹب کیا تھا۔ اس کے لئے ایک کھلا بازار تھا۔ جہاں وہ دن دھاڑے سب کی آنکھوں کے سامنے سیر گشت کیا کرتا تھا۔ جس دوکان سے جو سودا چاہتے مفت لیتا تھا، وہ بازار کا اس نعمت غیر مرقبہ کا واحد مالک تھا۔ شروع شروع میں چند گرسنہ بلیوں اور خارش زدہ کتوں نے شدید مزاحمت کی تھی۔ مگر اس نے مار مار کر سب کو باہر نکال دیا تھا۔ اور اب وہ اس کچرے کے ٹب کا واحد مالک تھا اور اس کے حق کو سب نے تسلیم کر لیا تھا۔ مہینے میں ایک بار میونسپلٹی والے آتے تھے اور اس ٹب کو خالی کر کے جاتے تھے، اور کچرا بابا ان سے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا۔ دوسرے دن سے ٹب پھر اسی طرح بھرنا شروع ہو جائیگا۔ اور اسکا اعتقاد تھا کہ اس دنیا سے

نیکی ختم ہو سکتی ہے، وفا ختم ہو سکتی ہے، رفاقت ختم ہو سکتی ہے لیکن غلاظت اور گندگی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ساری دنیا سے منہ موڑ کر اس نے جینے کا آخری طریقہ سیکھ لیا تھا۔

مگر یہ بات نہیں ہے کہ اسے باہر کی دنیا کی خبر نہ تھی۔ جب شہر میں چینی مہنگی ہو جاتی تو مہینوں کچرے کے ٹب میں مٹھائی کے ٹکڑے کی صورت نظر نہیں آتی۔ جب گندم مہنگی ہو جاتی تو ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہ ملتا۔ جب سگریٹ مہنگے ہو جاتے تو سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے اتنے چھوٹے ملتے کہ انہیں سلگا کر پی نہیں سکتا تھا۔ جب بھنگیوں نے ہڑتال کی تھی تو دو مہینے تک اس کے ٹب کی کسی نے صفائی نہیں کی تھی۔ اور کسی روز ٹب میں اسے اتنا گوشت نہیں ملتا تھا۔ جتنا بقرعید کے روز اور دیوالی کے دن تو ٹب کے مختلف کونوں سے مٹھائی کے بہت سے ٹکڑے مل جاتے تھے۔

باہر کی دنیا کا کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہ تھا۔ جس کا سراغ وہ کچرے کے ٹب سے دریافت نہ کر سکتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے لے کر عورتوں کے خفیہ امراض تک۔ مگر باہر کی دنیا سے اسے اب کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پچیس سال تک وہ اس کچرے کے ٹب کے کنارے بیٹھا بیٹھا اپنی عمر گزارتا رہا۔ شب و روز ماہ و سال اس کے سر سے ہو کے لہروں کی طرح گزرتے گئے۔ اور اس کے سر کے بال سوکھ سوکھ کر بڑی شاخوں کی طرح لٹکنے لگے۔ اور اس کی کالی ڈاڑھی کھچڑی ہو گئی۔ اس کے جسم کا رنگ ملگجی اور مٹ میلا اور سبزی مائل ہوتا گیا۔ اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں، پھٹے چیتھڑوں اور بدبودار جسم سے

راہ چلتے لوگوں کو خود بھی کچرے کا ٹب سا نظر آنے لگا۔ ایک ایسا ٹب جو کبھی حرکت کرتا تھا۔ اور بولتا تھا، کسی دوسرے سے نہیں، صرف اپنے آپ سے یا زیادہ سے زیادہ کچرے کے ٹب سے!

لوگ کچرا بابا کو کچرے کے ٹب سے گفتگو کرتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ حالانکہ اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ کچرا بابا ان سے کچھ کہتا نہیں تھا۔ مگر ان کی حیرت کو دیکھ کر دل میں ضرور سوچتا ہوگا کہ اس دنیا میں کون ہے جو کسی دوسرے سے گفتگو کرتا ہے۔ اس دنیا میں جتنی گفتگو ہوتی ہے انسانوں کے درمیان نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ صرف اپنی ذات اور اس کی کسی غرض کے درمیان ہوتی ہے، دو دوستوں کے درمیان بھی جو گفتگو ہوتی ہے۔ وہ دراصل ایک طرح کی خود کلامی ہوتی ہے۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا کچرے کا ڈھیر ہے۔ جس میں ہر شخص اپنی غرض کا کوئی ٹکڑا، فائدے کا کوئی چھلکا، یا منافع کا کوئی چیتھڑا، دبوچنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اونہہ۔ یہ لوگ جو مجھے حقیر، فقیر، یا ذلیل سمجھتے ہیں، ذرا اپنی روح کے کچھ اڑے میں تو جھانک کر دیکھیں، وہاں اتنی غلاظت بھری ہے جسے صرف موت کا فرشتہ ہی اٹھا کر لے جائے گا۔!

اسی طرح دن پر دن گزرتے گئے ملک آزاد ہوئے، ملک غلام ہوئے حکومتیں آئیں، حکومتیں چلی گئیں۔ مگر یہ کچرے کا ٹب وہیں کا وہیں رہا اور اس کے کنارے بیٹھنے والا کچرا بابا اسی طرح نیم غنودگی۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں دنیا سے منہ موڑے ہوئے زیر لب کچھ بدبداتا رہا اور کچرے کے ٹب گفتگو کرتا رہا۔

تب ایک رات اندھی گلی میں جب وہ ٹب سے چند فٹ کے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے اپنے پھٹے چیتھڑوں میں دبکا ہوا سو رہا تھا۔ اس نے رات کے سناٹے میں ایک خوفناک چیخ سنی اور وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔ پھر اس نے ایک زوردار چیخ سنی اور وہ گھبرا کر کچرے کے ٹب کی طرف بھاگا جدھر سے یہ چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

کچرے کے ٹب کے پاس جا کر اس نے ٹٹولا، تو اس کا ہاتھ کسی نرم نرم شے سے جا ٹکرایا اور پھر ایک زوردار کی چیخ بلند ہوئی۔ کچرا بابا نے دیکھا کہ ٹب کے اندر ردی کے ٹکڑوں، چچوڑی ہوئی ہڈیوں، پرانے جوتوں کا پنج کے ٹکڑوں۔ آم کے چھلکوں۔ باسی فینیوں اور کھٹرے کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے درمیان ایک نوزائیدہ بچہ ننگا پڑا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر زور زور سے چیخ رہا ہے۔

چند لمحوں تک کچرا بابا حیرت میں ڈوبا ہوا جامد و ساکت اس ننھے انسان کو دیکھتا رہا جو اپنے چھوٹے سے سینے کی پوری قوت سے اپنی آمد کا اعلان کر رہا ہے۔ چند لمحوں تک وہ چپ چاپ، پریشان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے تیزی سے آگے جھک کر کچرے کے ٹب سے اس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور جلدی سے اسے اپنے پھٹے چیتھڑوں میں چھپا لیا۔

مگر بچہ اس کی گود میں جا کر بھی کسی طرح چپ نہ رہا۔ وہ اس زندگی میں نیا نیا آیا تھا۔ اور بلک بلک کر اپنی بھوک کا اعلان کر رہا تھا۔ اسے معلوم نہ

نہ تھا کہ غریبی کیا ہوتی ہے۔ ماتما کس طرح بزدل ہو جاتی ہے زندگی کیسے حرامی بن جاتی ہے۔ وہ کس طرح میلے جیکٹ اور تھلیط بنا کر کچرے کے ٹب میں ڈال دی جاتی ہے۔ وہ کس طرح نہ تھا۔ ابھی وہ صرف بھوکا تھا اور رو رو کر اپنے پیٹ پر ہاتھ مار رہا تھا اور ٹانگیں چلا رہا تھا۔

کچرا بابا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیسے اس بچے کو چپ کرائے۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ نہ دودھ نہ چینی اسے تو کوئی لوری بھی یاد نہ تھی۔ وہ بے قرار ہو کر بچے کو گود میں لے کر تھپتھپانے لگا اور گہری نا امیدی سے رات کے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا کہ اسے اس وقت بچے کے لئے دودھ کہاں سے مل سکتا ہے لیکن جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اس نے جلدی سے کچرے کے ٹب سے آم کی ایک گٹھلی نکالی۔ اور اسکا سرا بچے کے منہ میں دیدیا۔

آدھ کھاتے ہوئے آم کا میٹھا میٹھا رس جب بچے کے منہ میں جانے لگا تو وہ روتا روتا یکایک چپ ہو کر کچرا بابا کی باہوں میں سو گیا۔ آم کی گٹھلی کھسک کر زمین پر جا گری اور اب بچہ اس کی باہوں میں بے خبر سو گیا تھا۔ آم کا پیلا پیلا رس ابھی تک اس کے نازک لبوں پر تھا اور اس کے ننھے سے ہاتھ نے کچرا بابا کا انگوٹھا بڑے زور سے پکڑ رکھا تھا۔

ایک لمحے کے لئے کچرا بابا کے دل میں خیال آیا۔ کہ وہ بچے کو یہیں پھینک کر کہیں بھاگ جائے۔ دھیرے سے کچرا بابا نے اس بچے کے ہاتھ سے اپنے انگوٹھے کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر بچے کی گرفت بڑی مضبوط تھی، اور کچرا بابا کو ایسے محسوس ہوا، جیسے زندگی نے اسے پھر سے پکڑ لیا ہے،

اور دھیرے دھیرے جھٹکوں سے اسے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ یکایک اسے دلاری کی یاد آئی اور وہ بچّہ جو اس کی کوکھ میں کہیں ضائع ہو گیا تھا۔ اور یکایک کچرا بابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آج سمندر کے پانیوں میں اتنے قطرے نہ تھے، جتنے آنسو اس کی آنکھوں میں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گزشتہ پچیس برسوں میں جتنی میل اور غلاظت اس کی روح پر جم چکی ہے، وہ اس طوفان کے ایک ہی ہلّے میں صاف ہو جائے گی۔

رات بھر کچرا بابا اس نوزائیدہ بچّے کو اپنی گود میں لئے بے چین اور بے قرار ہو کر فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا اور جب صبح ہوئی اور سورج نکلا تو لوگوں نے دیکھا کہ کچرا بابا آج کچرے کے ٹب کے قریب کہیں نہیں بیٹھا ہے، بلکہ سڑک کے پار نئی تعمیر ہونے والی عمارت کے نیچے کھڑا ہو کر اینٹیں ڈھو رہا ہے اور اس عمارت کے قریب گل مہر کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں ایک پھولدار کپڑے میں لپٹا ہوا ایک ننھا بچّہ... منہ میں دودھ کی چسنی لئے مسکرا رہا ہے۔

— ۔ نزہہ

قیدی

"تیری اپیل نامنظور ہوگئی ہے۔!" وارڈر نے گجندر کے کان میں آہستہ سے کہا۔" اب سپرنٹنڈنٹ صاحب تجھ کو حکم سنانے آرہے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وارڈر جلدی سے تالا لگا کر جیل کی کوٹھری سے باہر چلا گیا۔ اور جیل کی کوٹھڑیوں کے باہر برآمدے میں گشت کرنے لگا۔

گجندر غصّے میں بھرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچنے لگیں۔ اور بازوؤں کی آہنی مچھلیاں ابھرنے لگیں۔ گردن کی رگیں تن گئیں اور آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ یکایک وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اور جیل کی کوٹھڑی میں اس کا ساڑھے چھ فٹ اونچا لمبا جسم ایک پہلوان کی طرح کسرتی اور شاہ بلوط کے تنے کی طرح مضبوط نظر آیا۔ وہ بیحد تگڑا اور گرم مزاج تھا۔ اس کے بازو ہر وقت کسی چیز کو توڑنے کے لئے آمادہ نظر آتے۔ کچھ لوگوں کے جسم میں ان کی طاقت فولاد کی طرح منجمد نظر آتی ہے۔ گجندر کے جسم میں اس کی مہیب طاقت لاوے کی طرح بہتی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے لہو آگ ہوا آگ سیال

ہو اور یہ آتشیں سیال ایک دھڑکتے ہوئے سینے میں بند ہو۔

گجندر کا سینہ کسی طاقتور موٹر کے انجن کی طرح دھڑکنے لگا۔ غصے سے اس کا سارا جسم لرزنے لگا اور وہ دانت پیس پیس کر زیر لب کچھ بڑبڑانے لگا۔

وہ اس حالت میں تھا جب جیل کا سپرنٹنڈنٹ چھ وارڈروں کو لے کر سپریم کورٹ کا حکم سنانے کے لئے اس کی کوٹھڑی میں آیا۔ مگر سپریم کورٹ کا حکم تو گجندر اپنے وارڈر سے پہلے ہی سن چکا تھا۔ اس لئے وہ حکم سننے کا انتظار کئے بغیر اپنے دونوں ہاتھ جو لوہے کی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اٹھا کر سپرنٹنڈنٹ پر حملہ آور ہو گیا۔

گجندر نے اچانک اور اتنے زور سے سپرنٹنڈنٹ پر حملہ کیا تھا۔ اگر اس کا وار سیدھا پڑ جاتا تو سپرنٹنڈنٹ کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ مگر ہوشیار وارڈروں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے حملے کو ٹکڑے کے ڈنڈوں پر روکا۔ دونوں ڈنڈے ٹوٹ گئے اور سپرنٹنڈنٹ جو گھبرا کر پیچھے ہٹا تو چھ کے چھ وارڈر گجندر پر ٹوٹ پڑے۔

گجندر کے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے تھے اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ پھر بھی وہ اکیلا ان چھ وارڈروں پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اور لاتوں، مکوں، گھونسوں اور کبھی کبھی محض اپنے جسم کے زور سے سب کو دبائے جا رہا ہے اور زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ شور سنکر بہت سے وارڈر جمع ہو کر اندر آ گئے اور کوئی دس وارڈروں نے اسے مار مار کر قابو میں کیا۔

گجندر کے منہ سے کف اور خون بہہ رہا تھا اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ بڑا اپنی ماں کا حکم سنانے! سپرنٹنڈنٹ کا بچہ! میری ہتکڑی کھول دے اور پھر تماشہ دیکھو۔ تیرے ایک ایک وارڈر کو کچا نہ کھا جاؤں تو گجندر نام نہیں، اور تیری گردن تو تیرے کندھے سے یوں مروڑ کر اکھاڑ دوں جیسے کھیت سے مولی گاجر!

وارڈروں نے لوہے کے حک سے گجندر کو باندھ کے چھوڑ دیا۔ اور گجندر غم اور غصے سے اپنی ہتھکڑیوں سے بندھے ہوئے ہاتھ زور زور سے آہنی سلاخوں پر مارنے لگا۔ اپنی مجنونانہ طاقت کی بھرپور شدت سے اس نے آٹھ دس بار اتنے زور سے ہاتھ مارے کہ ہتھکڑیوں کی آہنی زنجیر لوہے کی سلاخوں پر سے بار بار ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ اسی وقت فوراً بارہ پندرہ وارڈر اس پر پل پڑے اور پندرہ بیس منٹ کی گھمسان کی لڑائی کے بعد گجندر پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ گو اس کوشش میں چار وارڈر شدید طور پر زخمی بھی ہو گئے۔

اب گجندر کو لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر فرش پر جکڑ کر ایک گٹھڑی کی طرح رکھ دیا گیا۔ نازک بدن پرسپرنٹنڈنٹ نے بڑی نخوت سے اپنے کڈ لیڈر شو سے گجندر کی پسلیوں کو ٹھوکر مار کر کہا۔

اسے لے جا کر کال کوٹھڑی میں بند کر دو!"

تین دن تک وہ زنجیروں سے بندھا کال کوٹھری میں اکیلا پڑا رہا۔ تین دن تک اسے کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا۔ صرف ایک وارڈر دن میں دو

مرتبہ اسے پانی پلانے کے لئے آتا رہا۔ اور کھڑے ایک لوٹے کی دھار سے اس کے منہ میں پانی انڈیل کر واپس جاتا رہا۔ جیل میں ہر شخص اس سے ڈرتا تھا۔ اور نفرت کرتا تھا۔ بڑے سے بڑے عادی مجرم اس سے خائف نظر آتے تھے۔ اور اس کے سائے سے دور بھاگتے تھے۔ کیونکہ وہ ان سب سے تگڑا چالاک، تیز و طرار اور طاقتور تھا۔ اور جب کسی ایک آدمی میں اتنی صفات اکٹھی ہو جائیں تو لوگ اس سے ڈرنے لگتے ہیں اور اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

یہ نفرت اس کے لئے نئی نہیں تھی۔ جیل خانے سے دور باہر اس کے گاؤں میں بھی ہر شخص اس سے نفرت کرتا تھا۔ کیونکہ گجندر بچپن سے ہی بیحد تگڑا اور دلیر تھا اور اپنے ساتھیوں پر بلا جیل و حجت ہاتھ صاف کر دیا کرتا تھا۔

ایک بار جب اس نے کلاس میں اپنے استاد کو پیٹ دیا تو وہ اسکول سے نکال دیا گیا۔ دوسری بار جب اس نے غصے میں آکر اپنے باپ کو پیٹا تو گھر سے نکال دیا گیا۔ وہ ایک وحشی سانڈ کی طرح اپنے گاؤں کے کھیتوں میں اور آس پاس کے گاؤں گھومتا تھا، کشتی میں، پنجہ لڑنے میں۔ لاٹھی چلانے میں، گالیاں دینے میں اور بے ضرورت جھگڑا کرنے میں اس کا ثانی نہ تھا۔ ایک بار جب وہ گاؤں کے نمبردار سے محض اس بات پر الجھ پڑا کہ وہ نمبردار کیوں تھا تو اس نے نمبردار کو اور اس کے تین چار حمایتیوں کو مار مار کر آدھ مرا کر دیا اور جیل خانے میں چھ مہینے کے لئے بند کر دیا گیا۔ دوسری بار اسے دو سال کی سزا ہوئی۔ کیونکہ اس نے اپنے علاقے کے تھانیدار کو گھوڑی سے اتار کر اپنی ٹانگوں کے

نیچے رکھ کر ٹھوکریں مار مار کر اسکا بھرکس نکال دیا تھا۔ کیونکہ تھانیدار کی پگڑی کا قطر اس کے طرّہ سے لمبا تھا۔ تیسری بار اسے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ اور اب وہ کال کوٹھڑی میں تھا۔ زنجیروں سے جکڑے جانے کے باوجود وہ اپنے جسم کے اندر اس قدر زندہ تھا کہ پھانسی کی سزا کا حکم سنکر اسے باور نہ ہوا تھا کہ ایک دن اس کی گردن میں ریشم کی رسّی ڈال کر، گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لئے اسکا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اس کے دل کے اندر زندگی کا احساس اس قدر قوی اور شدید تھا کہ آج اپیل کے نامنظور ہو جانے پر پہلی بار گویا اسے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ اور وہ چیتے کی طرح بپھر کر اپنی مدافعت کے لئے تیار ہو گیا۔ اسکا جی چاہنے لگا کہ اگر اس وقت کسی طرح ساری دنیا کے لوگ مجتمع ہو کر ایک انسانی ہیولے کی صورت میں اس کے سامنے آجائیں تو وہ گھونسے مار مار کر اس ہیولے کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

پھر اُسے جگل یاد آیا۔ اگر گجندر ہر وقت غصّے سے سلگتا رہتا تھا تو جگل ہر وقت خوشی سے چہکتا رہتا تھا۔ وہ تقریباً اتنا ہی اونچا، لمبا اور قد آور تھا جتنا گجندر۔ مگر وزن اور طاقت میں گجندر سے کم تھا۔ اس کے جسم میں فولاد کی سی لچک تھی۔ جو جھک سکتا ہے مگر ٹوٹ نہیں سکتا۔ جگل بے پرواہ اور کھلنڈرا تھا اور اپنے دوستوں میں بہت مقبول تھا۔ گاؤں کے سب

لڑکے اور نوجوان گجندر سے نفرت کرتے تھے اور جگل پر جان دیتے تھے۔ کیونکہ وہ نہایت ملنسار اور محبت کرنے والا نوجوان تھا۔ اور کسی پر بے جا رعب نہیں ڈالتا تھا۔ گاؤں کے نوجوانوں میں صرف جگل ہی ایک ایسا شخص تھا جو نہ گجندر سے نفرت کرتا تھا نہ اس سے ڈرتا تھا۔ جگل اکثر کہا کرتا تھا۔ گجندر تو ایک بیمار آدمی ہے، اسکا علاج ہونا چاہیئے!" مگر گجندر کا علاج کرنے کی ہمت کس میں تھی!

جگل گجندر کا دوست بھی تھا اور مخالف بھی۔ ان دونوں میں محبت اور مخالف کا عجیب سا رشتہ تھا۔ جگل ہر کھیل میں گجندر کو شریک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر کھیل میں شریک ہوتے ہی گجندر سب کو ڈانٹنے اور اپنا حکم چلانے میں مصروف ہو جاتا اور اس وقت جگل، ہر وقت ہنستے، چہکتے مسکرانے والا، جگل گجندر کا مخالف بن جاتا۔

کبڈی میں، رسہ کشی میں ہر کھیل میں، جس میں دوسرے نوجوان شریک ہوتے تھے جگل کی ٹیم اکثر اوقات گجندر کی ٹیم کو شکست دیتی تھی۔ گجندر کو اپنی طاقت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ کھیل کے دوران میں سب پر چھا جانے کی کوشش کرتا اور اس کوشش میں مخالفین ہی کو نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا اور ان کی ذرا سی غلطی پر انہیں جھڑک دیتا اور کبھی ہاتھ اٹھا کر دو ایک چپت بھی دیتا۔ اس کے اپنے ساتھی بھی اس سے ڈرتے تھے اور دل ہی دل میں اس سے نفرت کرتے تھے۔ وہ اکثر اوقات جگل سے جھگڑتے تھے وہ کیوں گجندر کو ان کے کھیل میں شریک کرتا ہے۔

اور جاوبے جا اس کی حمایت کرتا ہے۔ گجندر ایک بدقماش شیخی خورا، اپنی طاقت میں اندھا انسان ہے۔ اس سے دور ہی رہنا چاہیئے۔ مگر جگل اکثر سمجھا بجھا کر اپنے دوستوں کو گجندر کے ساتھ کھیلنے پر راضی کر لیتا۔

" ورنہ گجندر بالکل اکیلا پڑ جائے گا۔ جگل ان سے کہتا اور اکیلا آدمی بڑا خطرناک ہوتا ہے!"

اگر گجندر اور جگل کی اب تک دو بدو لڑائی نہیں ہوئی تھی تو اس کی وجہ سوہن تھا۔ سوہن جگل کا بھائی تھا۔ اور ہر وقت سائے کی طرح اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ بھائی ہونے کے باوجود دونوں میں ایسی گہری محبت اور رفاقت تھی کہ گہرے سے گہرے دوستوں میں بھی کیا ہوگی سوہن جگل سے کم لمبا اور طاقتور تھا، مگر پھرتی اور دلیری میں سب سے آگے تھا۔ اسے گجندر بالکل پسند نہیں تھا۔ مگر اپنے بڑے بھائی کے حکم کے مطابق وہ اسے ہر موقع پر برداشت کرتا تھا۔ حالانکہ اندر ہی اندر گجندر کی نخوت اور غرور پر اسکا خون کھولنے لگتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ گجندر سے بہت کمزور ہے۔ پھر بھی اسکا جی بار بار گجندر سے ٹکر لینے کو کرتا تھا۔ مگر ہر بار اسکا بڑا بھائی بڑے پیار و محبت سے سمجھا بجھا کر اسے اس کوشش سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔

" گجندر برا آدمی نہیں ہے۔ جگل اسے سمجھاتا۔ مگر اس کے گلینڈ غلط طریقہ پر کام کرتے ہیں۔ اسکا علاج ہونا چاہیئے۔

اور اپنے طریقے پر جگل دھیرے دھیرے گجندر کا علاج کرنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار مویشیوں کے سالانہ میلے کے موقع پر جب کلکٹر صاحب کے سامنے رسہ کشی کا مقابلہ ہونے لگا تو گجندر نے رسہ ہاتھ میں لے کر اور دھنکا کر کہا مجھے بارہ آدمیوں کی ٹیم نہیں چاہیئے، میں سب کے لئے اکیلا ہی کافی ہوں پھر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے بڑی حقارت سے بولا اٹھالے جاؤ یہ سب کوڑا کرکٹ، اور لے آؤ میرے سامنے بارہ مخالفوں کو۔ ان سب کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔!"

اس پر گجندر کی ٹیم کے ساتھی اس سے خفا ہو کر الگ بیٹھ گئے۔

دوسری طرف جگل نے رسہ تھام لیا اور اس کے پیچھے پیچھے سوہن چلا آیا۔

" وہ باقی کے دس جوان کہاں ہیں تیرے؟ گجندر نے بڑی تحقیر سے جگل کو مخاطب کیا۔

جگل نے ہنس کر کہا۔" تیرے لئے ہم دونوں بھائی کافی ہیں۔"

گجندر نے بلند آواز میں نعرہ لگا کر اپنی قوت کا جو پورا زور لگایا تو کئی گز تک دونوں بھائی کو کھینچتا ہوا لے گیا۔ مگر آدھے راستے میں جگل اور سوہن نے جو مل کر ایک ساتھ زور لگایا تو گجندر کو آدھے راستے پر روک لیا۔ چند منٹ تک دونوں پلڑے برابر رہے۔ پھر گجندر نے جو اپنے جسم کی پوری قوت لگا کر کھینچائی شروع کی تو دو تہائی راستہ پر دونوں بھائیوں کو کھینچ کر لے گیا۔ اس کی آنکھوں میں غرور اور نخوت کی چمک ابھر آئی اور وہ زور سے ہنسنے لگا۔ لیکا یک اسی وقت دونوں بھائیوں نے مل کر رسے کو ایسا شدید جھٹکا

دیا کہ گجندر اپنی تمام طاقت کے باوجود ان کی طرف کھنچتا چلا گیا اور ایک بار جو وہ کھینچنے لگا تو دونوں بھائیوں نے ایک لمحے کے لئے اپنی مجتمع طاقت کی لے کو نہیں توڑا اور ہر جھٹکے پر شدید زور لگانے پر بھی گجندر کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے سے ڈیوڑھی طاقت کے جھٹکوں سے کھنچا چلا جا رہا ہے۔ جگل اور سوہن کے ہاتھ الگ الگ تھے۔ مگر اس وقت رسّے پر یوں جمے تھے جیسے اپنے چار ہاتھوں سے رسّے کو اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔

کلکٹر صاحب کے سامنے گڑے ہوئے نیزے پر پہنچنے سے پہلے ہی گجندر نے رسّہ چھوڑ دیا اور ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا میلے سے رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن کبڈی کے کھیل میں گجندر نے بدلہ لینے کی کوشش کی۔ گاؤں کے باہر ایک پرانے قلعے کے کھنڈر تھے۔ اس کھنڈر کی بہت سی دیواریں گر گئی تھیں۔ کچھ باقی تھیں۔ کئی جگہ بڑے بڑے ستون کھڑے تھے۔ چند برجیاں سلامت تھیں اور چند برآمدے اور کمرے جن میں چمگادڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ قلعے کے اندر شکستہ ستونوں سے گھرا ہوا ایک میدان تھا جو کسی زمانے میں دیوان خاص تھا اور اب ہر خاص و عام تھا۔ اس دیوان کا فرش اکھڑ چکا تھا، دیواریں ... گر چکی تھیں اور اس میں گھاس اگ آئی تھی اور اب یہ جگہ کبڈی کے لئے نہایت موزوں تھی۔

قلعے کے باہر اسّی سیڑھیوں کا چبوترہ تھا۔ چبوترے سے اتر کر ایک

برجی آتی تھی، جسکے اندر گاؤں کی عورتوں نے تلسی اگا رکھی تھی، اور اب یہاں تلسی کی پوجا ہوتی تھی۔ برجی جی کے قریب ایک کنواں تھا۔ جسکا پانی سب سے ٹھنڈا میٹھا اور صاف ستھرا سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ قلعہ گاؤں سے باہر اور ذرا دوری پر واقع تھا۔ پھر بھی گاؤں کی عورتیں دن میں ایک بار یہاں ضرور آتی تھیں اور کم سے ایک گھڑا پانی کا بھر کے پینے کے لئے اپنے گھر ضرور لے جاتی تھیں اور کنوئیں سے ذرا دور املی کے گھنے پیڑوں کی قطار کی آڑ میں مردوں کی نظروں سے بچ کر مردوں کی باتیں کرتی تھیں۔

دوسرے دن کی چاندنی رات میں جب قلعے کے کھلنڈروں میں کبڈی کا کھیل جما تو پہلے ہی ہلّے میں گجندر نے جگل کو اپنے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ ایک بار تو اس کے دونوں بازو جگل کے گرد آ گئے تھے مگر پلٹیز اس کے کہ گجندر ان کی گرفت مضبوط کرتا، جگل تڑپ کر اس کی باہوں سے پھسل گیا۔ اور کبڈی کرتا ہوا واپس اپنے ٹولے میں چلا گیا۔

دوسرے کھیل میں گجندر کو بیحد غصہ آیا۔ وہ کبڈی کبڈی کہتا ہوا، جوں جگل کے ٹولے پر حملہ آور ہوا تو ایک ہی وار میں جگل کے سب ساتھیوں کو صاف کر گیا سوائے سوہن کے۔ اب جگل کے ساتھ صرف سوہن رہ گیا تھا۔ ادھر گجندر کی ٹولی پوری سلامت تھی۔

جگل نے آنکھ کے اشارے سے سوہن کو کچھ مشورہ دیا۔ اور بھائی کا مشورہ فوراً سمجھ کر سوہن نے بڑی احتیاط سے لائن کے کنارے کنارے یوں کبڈی کہی جیسے وہ کبڈی کھیلنے کے بجائے جھاڑو دے رہا ہو، پھر وہ فوراً

پلٹ کر اچھلا اور واپس چلا گیا۔

گجندر نے سوچا اب مزہ چکھانے کا موقع ہے۔ وہ بے خطر ٹھنکارتا ہوا شیر ببر کی طرح دھاڑتا ہوا، سینہ پھلائے ایک دیو کی طرح بھاگتا ہوا جگل کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر جگل اور سوہن ساتھ ساتھ تھے۔ ایک گجندر کے دائیں اور دوسرا بائیں۔ دونوں ہولے ہولے طرح دیتے ہوئے پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔

یکایک ایک جھپٹا مار کر گجندر نے جگل کو کندھے سے چھو لیا۔ چھوتے ہی جگل گجندر کی دائیں ٹانگ سے لپٹ گیا۔ اور عین اسی لمحے دوسری طرف سے سوہن بائیں ٹانگ سے لپٹ گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ گجندر بھاگ سکتا۔ دونوں بھائیوں نے ایک لمحے میں ایک ساتھ جو زور لگایا تو گجندر کے قدم اکھڑ گئے اور وہ زمین پر گر پڑا مگر دم نہ توڑا اور وہ برابر کبڈی کہتا ہوا دونوں بھائیوں کو اپنی ٹانگوں سے گھسیٹتا ہوا لائن پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور یکایک اسے محسوس ہوا جیسے یہ کوئی کھیل نہ تھا۔ ایک گہری فیصلہ کن لڑائی تھی۔ وہ اپنے جسم کا پورا زور لگا کر لائن کی طرف گھسٹنے لگا۔ ہر انچ پر دونوں بھائی پورا زور لگا کر اس کو لائن تک پہنچ جانے کے لئے روک رہے تھے اور گجندر نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ آج چاہے اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں، مگر اس کا دم نہیں ٹوٹے گا۔ آہستہ آہستہ ایک ایک انچ فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ زمین پر گھسٹتے گھسٹتے اور دونوں بھائیوں کا زور اور بوجھ لادے ہوئے وہ آہستہ آہستہ لائن کی طرف گھسٹتا گیا۔ لائن بالکل اس کے قریب آ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے

جولائن کو چھونا چاہا تو لائن اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے صرف چھ سات انچ دور تھی۔ جنگل اور سوہن نے بھی لیٹے لیٹے ایک بار گردن اٹھا کے اس فاصلے کو دیکھ لیا اور پھر وہیں اپنے چہروں کو زمین پر چھپائے گجندر کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ جیسے وہ زمین ہی کا ایک حصہ ہوں اور جیسے گجندر کی ٹانگیں انسانی ہاتھوں میں نہ ہوں جڑوں کی طرح زمین میں گھس گئی ہوں۔ دو تین بار گجندر نے شدید کوشش کی مگر اس کے بعد وہ ایک انچ آگے نہ بڑھ سکا۔ مایوس ہو کر اس نے اپنا تن بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کا دم ٹوٹ گیا اور وہ غم اور غصے سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگا۔

مگر کیوں؟ مگر کیوں؟ جنگل نے اسے سمجھایا۔ کبڈی تو ایک کھیل ہے۔ گجندر نے زور سے ایک چانٹا جنگل کے منہ پر مارا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

یہ جنگل اور گجندر کی دشمنی کی ابتدا تھی جیسے موہنی نے ہاوی پہلے پہل موہنی گجندر سے محبت کرتی تھی۔ اسے گجندر کا اکیلا پن پسند تھا۔ جیسے شیر جنگل میں اکیلا گھومتا ہے۔ اسے گجندر کی گالیاں پسند تھیں اور اس کی وحشیانہ قوت اور ساری دنیا سے ٹکر لینے کی آرزو اور چیزوں کو توڑنے پھوڑنے کی خواہش اور اس خواہش میں اب موہنی بھی شامل ہو گئی تھی۔ موہنی کو دیکھ کر گجندر کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ ڈالے۔ اس لئے نہیں کہ موہنی بدصورت

تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ انتہائی خوبصورت تھی اور کانچ کی ایک خوبصورت صراحی کی طرح نازک اور حسین تھی۔ گجندر کو گمان تھا جس دن وہ اس کی کمر کو اپنی مٹھی میں لے لے گا وہ ایک چھناکے سے ایک ہزار ٹکڑوں میں ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے تو اس کا دل ہر لحاظ موہنی کو چھونے کے لئے کانپتا تھا۔ اور موہنی بھی اس کی عجیب غریب بے بس اور مظلوم نگاہوں سے دیکھتی ہوئی گھڑا سر پہ رکھے ہوئے املی کے پیڑوں کی آڑ میں غائب ہو جاتی تھی۔ یہ ایسے کیوں دیکھتی ہے میری طرف؟ گجندر نے کئی بار سوچا، جیسے یہ مظلوم ہو، میں ظالم ہوں اور اسے ظلم پسند ہے! کس طرح کی لڑائی ہے؟ اسے یہ دیکھ کر میرے ہاتھوں میں خارش ہونے لگتی ہے اچھا ہے یہ میرے ہاتھ نہیں لگی اب تک، ورنہ اب تک اس کی گردن مروڑ چکا ہوتا۔

لیکن ایک دن گجندر سے رہا نہیں گیا۔ اس نے سرِ شام جب عورتوں کی قطار املی کے گھنے پیڑوں کی قطار میں غائب ہو رہی تھی موہنی کو کلائی سے پکڑ کر اپنے قریب کھینچ لیا۔ اتفاق سے اس وقت موہنی قطار میں سب سے آخر میں چل رہی تھی۔ اس لئے کسی عورت نے اسے املی کے گھنے پیڑوں کے پیچھے غائب ہوتے نہیں دیکھا۔

موہنی نے صرف اتنا دیکھا کہ ایک مضبوط مردانہ ہاتھ املی کے سایوں میں سے نکلا اور اسے گھسیٹ کر اپنی طرف لے گیا۔ گھبراہٹ میں اس کے سر میں رکھا ہوا گھڑا املی کی ایک جھکی ہوئی ڈالی سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور چند لمحوں تک ڈال کے پتوں سے پانی برسا کہ گجندر اور موہنی دونوں اس کے

نیچے کھڑے بھیگ گئے اور جب گجندر نے موہنی کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ریشم کا گچھا اس کے ہاتھ میں آگیا ہو۔ جو لچک سکتا ہے۔ مگر ٹوٹ نہیں سکتا اور گجندر یہ جان کر بہت حیران ہوا کہ مرد عورت کی ملائمیت کے آگے بالکل بے بس ہے۔

دیر تک موہنی اس کے چوڑے چکلے سینے سے لگی لرزتی رہی اس کی لرزش کو محسوس کر کے گجندر بولا۔ "ڈرتی ہو؟"

موہنی سسکتی ہوئی بولی۔ "اپنے لئے نہیں، تمہارے لئے ڈر لگتا ہے۔!"

"میرے لئے؟" گجندر حیرت سے بولا۔ "میرے لئے!"

"وہ کیوں؟"

"جس کے پاس ایسی بے پناہ قوت ہو، اس کی زندگی کی طرف سے ڈر لگتا ہے۔" موہنی بولی۔

"میری زندگی کی فکر نہ کرو!" گجندر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔

"عجیب لڑکی ہو، پہلی بار اتنی قریب سے ملی ہو اور ملتے ہی کیسی عجیب عجیب باتیں کر رہی ہو؟ یہ بتاؤ مجھ سے شادی کرو گی۔؟"

"نہیں!"

"کیوں نہیں۔!" گجندر نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"کیا سچ مچ تم نہیں جانتے۔!" موہنی نے اس کے سینے سے سر اٹھا کے پوچھا۔

"نہیں!" گجندر نے انکار میں سر ہلا دیا۔
موہنی گجندر کی صورت غور سے تکتے ہوئے بولی۔
"میری منگنی تو جنگل سے ہو چکی ہے۔ بچپن ہی سے ... مگر مجھے تم تم بہت پسند ہو۔"
مگر اس کے آگے گجندر نے کچھ نہیں سنا۔ وہ اسی وقت موہنی کو دھکا دیکر وہاں سے بھاگ گیا۔

گجندر نے انتہائی سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کیا۔ یعنی جہاں تک کہ غور کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے جنگل کے پاس ایک پیغام بھیجا۔
"یہ آج شام کو مجھے تلعے کے کھنڈروں میں ضرور ملو۔ مجھے تم سے ضروری کام ہے۔!"
سوہنی کسی ضروری کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ اس لئے جنگل اس سے مشورہ بھی نہ کر سکا اور سیدھا گجندر سے ملنے کے لئے اکیلا چلا گیا۔
گجندر دیوان خاص کے پچھواڑے کے ایک ستون کے قریب کھڑا اسے زور زور سے مکے مار رہا تھا۔ زور کا مکا مارنے سے ستون کے اندر سے ایک عجیب و غریب آواز پیدا ہوتی تھی جو اپنی گونج میں موسیقی سے مشابہ تھی۔ ستون پر جتنے زور کا مکا پڑتا، موسیقی اتنی ہی بلند ہوتی تھی۔ گاؤں کے

جوان اکثر اس ستون پر مکے مار مار کر اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

جب گجندر نے جگل کو اپنے قریب آتے دیکھا تو مکے مارتے مارتے چند لمحوں کے لئے رک گیا۔ جگل کی طرف بڑے غور سے دیکھ کر بولا۔

"میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔!"

جگل نے مسکرا کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھا دیا اور بولا

"میں تو ہمیشہ سے یہی چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے!" گجندر نے ستون پر ایک مکا مار کر کہا۔

"پھر دیر کیا ہے ہاتھ ملاؤ!" جگل نے اپنا ہاتھ اور آگے بڑھا دیا۔

گجندر نے ہاتھ کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے دوسرا مکا تان کر زور سے ستون پر مارا اور ستون لرز کر گونجنے لگا۔

گجندر بولا "میری ایک شرط ہے۔"

"دوستی میں شرط بھی ہوتی ہے؟" جگل نے پوچھا۔

"ہاں۔!" گجندر مکا تانتے ہوئے بولا۔

"بولو۔ کیا شرط ہے تمہاری؟"

"تم موہنی کو چھوڑ دو!" گجندر نے آہستہ سے مگر بے حد مضبوط لہجے میں کہا اور پھر تان کر جو مکا مارا تو اس کی دھمک سے ستون بنیادوں تک لرز گیا۔

یکایک بجلی کی سی تیز حرکت۔۔۔ جگل نے گجندر کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور عین اسی وقت ستون کی چوٹی سے ایک بڑا پتھر کھسکا اور

گڑگڑاتا ہوا نیچے آرہا جہاں ایک لمحے پہلے گجندر کھڑا تھا۔ اس نے بڑے پتھر کے پیچھے تین چار پتھر کھسکے اور بہت سی مٹی اور چونا اور ملبے کا ڈھیر ستون کے قدموں میں لگ گیا۔ جگل کی بروقت کوشش سے گجندر کی جان بچ گئی تھی۔

گجندر نے ایک لمحے کے لئے ملبے کو ڈھیر کو دیکھا۔ اور پھر پلٹ کر جگل کی طرف بڑھا اور اپنے مضبوط ہاتھ اس کے چوڑے کندھوں پر رکھ کر بولا۔

"تم اور ہم دونوں مل جائیں تو ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں!"

جگل نے اس کی بات سن کر اس کے اپنے کندھوں سے جھٹک دیئے اور بیزار ہو کر بولا۔

"مجھے دنیا کو فتح کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں اپنے گاؤں میں رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی موہنی کے ساتھ اور اس کے بچوں کے ساتھ۔ یکایک اس کا چہرہ پھر روشن ہو گیا۔ موہنی کا خیال آتے ہی اور گجندر کو ایسا لگا اس کے سینے میں کچھ ٹوٹنے لگا ہو۔

"وہ تم سے نہیں مجھ سے محبت کرتی ہے!" گجندر نے فاتحانہ انداز میں جگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جگل کا چہرہ فق ہو گیا۔ رکتے رکتے بولا "تم سے کس نے کہا۔"

"موہنی نے خود کہا ہے مجھ سے!" گجندر بولا۔

جگل چپ ہو گیا۔ دیر تک چپ رہا۔ دیر تک اپنے ذہن میں گجندر کے

دعوے کو الٹ پلٹ کے دیکھتا رہا۔ آخر جیسے اپنے ذہن کو کھنگالتے کھنگالتے اسے موہنی کی کوئی شیریں ادا یا دل لبھانے والا وعدہ یاد آگیا اسکا چہرہ پھر روشن ہو اٹھا۔ مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے بولا۔

"نہیں نہیں۔ وہ تم سے محبت نہیں کر سکتی"۔ ممکن ہے تمہاری طاقت سے مرعوب ہو کر اس نے ایسا کہا ہو اور عورتیں طاقت سے جلد مرعوب ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے کسی فوری جذبے سے متاثر ہو کر اس نے ایسا کیا ہو، کیونکہ عورتیں کسی فوری جذبے میں ڈوب کر غلط باتیں بھی کہہ دیتی ہیں مگر موہنی کا گہرہ جذبہ صرف مجھ سے ہی وابستہ ہے!"

وہ اب گجندر سے بات کر رہا تھا۔ گجندر کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر وہ سر جھکائے سوچتے ہوئے قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف جا رہا تھا جو قلعے کے پچھواڑے کی گہری خندق میں جا گرتی ہے۔ اس مضبوط اور جید دیوار کے پتھر مختلف مقامات سے اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ اور گر کر نیچے خندق میں جا گرے تھے۔ اور گرتی ہوئی دیوار کے مختلف حصّوں میں جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔

جگل کی پیٹھ گجندر کے سامنے تھی۔ کیونکہ اب وہ دیوار کے ایک ہلتے ہوئے پتھر پر اپنا ایک پاؤں رکھے، دوسرا پاؤں چبوترے کے فرش پر رکھے موہنی کے بارے میں سوچ رہا تھا! اور گجندر جگل کی گردن کا مضبوط مردانہ خم دیکھ رہا تھا اور اسکا غور و فکر میں ڈوبا ہوا سنجیدہ چہرہ، باوقار اور وجیہہ جگل اپنے گاؤں کے جوانوں میں سب سے زیادہ حسین اور معقول بھی

سمجھا جاتا ہے۔ اور یکایک اسے یوں غور و فکر میں ڈوبے دیکھ کر گجندر کا دل مایوسی سے بھر گیا اور اس کے دل میں موہنی کے سلسلے میں تاریک شک و شبہات گزرنے لگے اور اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا، اور خیال آیا کہ اگر موہنی والا معاملا لمبا کھنچا تو ممکن ہے جیت آخر میں جگل کی ہو۔ جیسے کبڈی میں یا رسہ کشی دوسرے کھیلوں میں گجندر کی بلا تاخیری کے باوجود کئی بار جیت جگل کی ٹیم کی ہو جاتی تھی۔ جگل کو یوں سوچ میں ڈوبے اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھ کر جیسے گجندر کا دل جگل کے سامنے ہی نہ ہو... گجندر کا دل جگل کے لئے انتہائی بیزاری اور غصے اور نفرت سے بھر گیا خون اس کی شریانوں میں کسی تیز رفتار کار کی طرح دوڑنے لگا۔ اسکا منہ لال ہو گیا۔ آنکھیں سرخ اور وہ دبے پاؤں بے آواز قدموں سے جگل کی پیٹھ کی جانب بڑھا۔ اور اس نے پیچھے سے جگل کو اپنے فولادی ہاتھوں کے شکنجے میں کس کر اوپر اٹھا لیا۔ اور دھڑام سے نیچے گرتی ہوئی دیوار کے پتھروں پر دے مارا۔

جگل کو صرف اتنا موقع ملا تھا کہ وہ گردن پلٹ کر صرف ایک لمحے کے لئے گجندر کو دیکھ لے۔ جگل صرف ایک نگاہ بھر کے... گجندر کو دیکھ سکا۔ دوسرے لمحے میں وہ ہوا میں تھا۔ اور تیسرے لمحے اسکا جسم اس زور دار دھماکے سے گرتی ہوئی دیوار کے پتھروں سے ٹکرایا کہ اس کا جسم کا بند بند شکستہ ہو گیا۔ اس کا جسم دیوار کے پتھروں سے ٹکراتا اگی ہوئی جھاڑیوں سے الجھتا پڑتا دور نیچے خندق میں جا گرا اور خندق میں گرے ہوئے پتھروں سے ٹکرا کر

ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

تھانے میں موہنی نے اس پر تھوک دیا تھا۔

عدالت میں بھی کسی نے گجندر کے حق میں گواہی نہیں دی۔ اس کے باپ نے بھی سیشن سے ہائی کورٹ اور ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک کوئی اس کے حق میں نہیں بولا۔ اور جب ہر جگہ سے اس کی پھانسی کی تصدیق ہو گئی تو وہ یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ اس کی سزا پر ہر شخص نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا ہے۔ اور وہ اس لئے حیرت زدہ تھا کہ اس کے اپنے دل کے اندر جگل کو قتل کرنے پر کسی طرح کا احساس جرم نہ تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی صرف اس کے اپنے محور پر گھومتی ہوئی ایک عظیم طاقت ہے۔ ساری دنیا کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور اس کے اردگرد جو کچھ بھی ہے اس مرضی اور حکم کے اشارے پر ہے۔ جگل نے چونکہ اس کی جابر مرضی کی نافرمانی کی تھی اس لئے اس نے جگل کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستے سے ہٹا دیا اس لئے جوں جوں اس کی مرضی کو بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنائی گئیں۔ اس کی نفرت اپنے ماحول کے لئے اور لوگوں کے لئے بڑھتی گئی اور وہ جیل خانے کے اندر بھی اپنی نفرت اور غصے کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی زندگی کی منطق یہی تھی۔

تین دن تک وہ کال کوٹھڑی میں زنجیروں سے بندھا فرش پر بھوکا تڑپتا رہا۔ پانچویں دن وارڈروں نے آکر اس کی زنجیریں کھولیں اور اس کے سامنے کھانا رکھا۔ وہ ایک بھوکے جانور کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا کھا کر اور پانی پی کر جب اس نے پہلی بار دونوں وارڈروں پر نگاہ ڈالی

تو اسے یہ دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے حیرت ہوئی کہ دونوں وارڈر نئے نئے اور بندوقوں سے مسلح تھے۔

"وہ پرانے وارڈر کہاں گئے۔؟" اس نے غرا کر پوچھا۔

"لام پر گئے ہیں۔"

"لام؟ کیسی لام؟" وہ حیرت سے بولا۔

"چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہے۔" ایک وارڈر نے بتایا۔

"چین نے؟ چین نے؟" وہ دوبارہ حیرت سے بولا۔

"ہاں! دوسرا وارڈر بولا۔ جیل کے بہت سے وارڈروں نے اپنے آپ کو فوجی بھرتی کے لئے پیش کر دیا ہے۔"

"مگر چین نے؟ حملہ؟۔ کیوں؟ کیوں؟ گجندر حیرت سے پوچھنے لگا۔ "چین تو ہمارا دوست تھا؟"

"مجھے کیا معلوم؟ پہلا وارڈر اس کے سامنے سے خالی تھان ہٹاتے ہوئے بولا، اور پھر وہ دونوں وارڈر اسے زنجیروں سے باندھ کر چلے گئے اور کوٹھڑی کا دروازہ زور کے چھناکے سے بند ہو گیا۔

اس رات اسے نیند نہیں آئی۔

ساری رات وہ زنجیروں میں بندھا کلبلاتا رہا اور سوچتا رہا عجیب بات تھی۔ چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ وہ چین جو ہندوستان کا دوست تھا، ہمسایہ تھا۔ صدیوں کا رفیق تھا۔ جس کی محبت اور بھائی چارے

کے بارے میں بار بار تقریروں، جلسوں اور اخباروں میں گزشتہ چند سالوں میں اتنا اتنا کہا گیا تھا۔ کہ وہ سب کچھ پڑھ پڑھ کر اور سن سن کر اس کے کان پک گئے تھے۔ اس چین نے آج ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا۔ مگر کیوں! کس موقع پر ہندوستان نے چین کی مدد نہیں کی تھی۔ کب اس کی طرف آشتی اور ہمدردی کا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ ہم ہندوستانی چین کے لئے گزشتہ دس بارہ سالوں میں ساری دنیا سے لڑائی مول لینے کے لئے تیار تھے۔ اور ہر جگہ اس کے سب سے بڑے طرفدار اور دوست اور رفیق سمجھے جاتے تھے تو پھر اس نے ہم پر حملہ کیوں کیا تھا۔

رات کو بہت دیر تک وہ اسی طرح سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے خیالوں کی کڑیاں اک نگاہ سے ٹوٹ گئیں۔ سوچتے سوچتے اچانک کہیں سے اس کے ذہن میں جگل کی نگاہ کوند گئی اور وہ اٹھ کر فرش پر بیٹھ گیا اور اس کا سارا جسم اس نگاہ کو یاد کرتے ہی کانپنے لگا، وہ آخری نگاہ جو جگل کی تھی، جب گجندر نے پیچھے سے جگل پر وار کیا تھا، بس وہ ایک ہی نگاہ تھی۔ حیرت، اور درد اور استعجاب میں ڈوبی ہوئی۔ مگر کتنی دور سے اس نگاہ نے پلٹ کر اس وقت جیل کی کوٹھری میں اس پر حملہ کیا تھا۔ وہ حیرت بھری نگاہ ایک سیدھے، تیز برچھے کی طرح گجندر کے دل میں اترتی چلی گئی۔ کیسی مکمل حیرت تھی۔ اس مرنے والی نگاہ میں؟ کیسا بھیانک خوف تھا۔ اس نگاہ میں، جیسے اچانک کسی پر اعتقاد ٹوٹ جائے۔ اس نگاہ کا گہرا، استعجاب میں ڈوبا ہوا، شکایت کا طنز چاقو کے نکلے پھل کی طرح گجندر کی شہ رگ پر چلنے لگا اور انتہائی کرب آمیز طریقے سے گجندر کی سمجھ میں آگیا کہ جگل کو قتل

کر کے اس نے کیسی بیوفائی کی تھی اور چین نے ہندوستان پر حملہ کر کے کیسی غداری کی تھی؟ اور جب یہ احساس اس کے دل میں رچنے لگا تو اس نے گھبرا کر اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اس نگاہ کی تاب نہ لا سکتا ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے اور خون کی گردش مدھم ہونے لگی۔

رات کے تیسرے پہر میں پہرہ دینے والے سنتری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آہنی سلاخوں میں تنہا کال کوٹھڑی کے اندر ایک بے خوف قاتل دھاڑیں مار مار کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

دوسرے دن وارڈروں نے دیکھا کہ قیدی کا وطیرہ بہت بدلا ہوا ہے۔ اسکا غصہ بہت کم ہو گیا تھا۔ اب وہ وارڈروں کو بات بات پر گالی دینے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ مگر وہ بے لہجے میں جیسے کوئی وحشی اور جنگلی اکھڑے اکھڑے لہجے میں تہذیب کی پہلی ادا سیکھے۔ اگلے چند دنوں میں وہ بار بار اخبار مانگنے لگا۔ اور چینی حملے کے بارے میں خبریں سننے اور جاننے کے لئے بیتاب رہنے لگا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ ایسا کیوں ہوتا جا رہا ہے اور اکثر وارڈر تو بے لہجے میں اسکا مذاق اڑانے لگے تھے۔ مگر اب گجندر نے ان پر خفا ہونا ترک کر دیا۔

دھیرے دھیرے اس نے اپنے اندر ایک اور گہری تبدیلی محسوس کی۔ اسے آہنی سلاخوں کے باہر نظر آنے والے آسمان سے گہری انسیت محسوس ہونے لگی۔ صبح و شام جب وہ جیل کے کھلے صحن میں ٹہلنے کے لئے لے جایا جاتا تو اسے آب جامن اور املی کے پیڑوں کو دیکھ کر ان سے ایک عجیب و غریب

اپنائیت محسوس ہونے لگی۔ کوئل کی کوک اور مینا کی چہکاریں اسے دلچسپ پیدا ہونے لگی۔ وہ وارڈروں کے نام پوچھنے لگا۔ ان کے گھر، بیوی بچوں کی باتیں کھیتی باڑی کے مسائل پر گفتگو کرنے لگا۔ ایسی باتیں آج تک اس کے ذہن میں کبھی نہیں آئی تھیں۔ اچانک وہ گلاب کے پودوں کی ایک کیاری کا بہت گرویدہ ہو گیا جس پر ابھی تک پھول نہیں آتے تھے۔ اور اس نے سپرنٹنڈنٹ سے اپنے گزشتہ سلوک کی معافی مانگتے ہوئے اس نے بڑی لجاجت سے درخواست کی کہ وہ اسے جب تک وہ زندہ ہے اس کیاری کو پانی دینے کی اجازت دی جائے۔

سپرنٹنڈنٹ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تمہیں اس سے کیا حاصل ہوگا! جب تک ان کیاریوں میں پھول آئیں گے تم اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہو گے، تم ان پھولوں کو نہیں دیکھ سکو گے۔"

گجیندر سر جھکا کے آہستہ سے کہا "کوئی تو دیکھے گا۔"

گجیندر نے سر جھکا کے اپنے نرم ملائمت آمیز لہجے میں یہ بات کہی کہ سپرنٹنڈنٹ پریشان ہو گیا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ اس دیو ہیکل آدمی سے کیا کہے جو ایک پشیمان ہاتھی کی طرح سونڈ لٹکائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اس کی درخواست منظور کر لی۔

۱

چند دنوں کے بعد جب گجیندر کا وکیل اس سے ملنے کے لئے آیا تو اس نے بتایا کہ سومتی جس نے گجیندر کو جان سے مار ڈالنے کی قسم کھائی تھی اپنی قسم

توڑ کر فوج میں بھرتی ہو کر لام پر چلا گیا ہے۔ موہنی گاؤں چھوڑ کر اپنے چچا کے گھر بڑے شہر چلی گئی ہے۔ گاؤں کے بہت سے جوان فوج میں بھرتی ہو کر جا چکے ہیں۔ اب قلعے کے میدان میں کبڈی نہیں ہوتی اور گاؤں کی عورتوں نے قلعے کے کنویں سے پانی لینا بند کر دیا ہے۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وکیل نے ایک درخواست گجندر کے آگے بڑھا دی۔

"یہ کیا ہے؟" گجندر نے پوچھا۔

"رحم کی درخواست ہے!" صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں۔" وکیل نے جواب دیا۔

چند لمحوں تک گجندر چپ رہا۔ درخواست کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے وہ درخواست دستخط کئے بغیر وکیل کے ہاتھ میں تھما دی

وکیل حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

گجندر بولا "مجھے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

مرنے سے چند گھنٹے قبل اس نے جیل کے ڈاکٹر کو بلا کے کہا۔

"میں چاہتا ہوں ڈاکٹر آج تم میرے جسم سے اتنا خون نکال لو کہ میرے جسم بس اتنا خون رہ جائے جس کے سہارے میں خود چل کر پھانسی کے تختے تک جا سکوں، باقی سب خون نکال کے تم فوجی سپاہیوں کے لئے بھیج دو

میرے وطن کی حفاظت کے لئے لڑ رہے ہیں!"

آخری بار خون دے کر جب وہ پھانسی کے تختے کی طرف جا رہا تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ آج پھانسی پر چڑھنے والے قاتل کا چہرہ ایک عجیب خوشی سے گلنار ہے۔ پھانسی کی طرف اس کے قدم ایک باوقار اور سنبھلی ہوئی کیفیت سے اٹھ رہے ہیں۔ ہولے ہولے اس کے قدم تیز ہوتے گئے اور ان میں ایک فوجی مارچ کا انداز آ گیا۔

لیفٹ رائٹ ... لیفٹ رائٹ ... مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے خود اس نے ایسا محسوس کیا، جیسے وہ پھانسی کے تختے کی طرف نہیں جا رہا ہے، بلکہ اپنے وطن کو بچانے کے لئے جنگ کے مورچے پر جا رہا ہے۔

دسواں پُل

چھ ہزار فٹ کی بلندی پر... پہاڑوں کے پیالے میں سرینگر یوں بستا ہے جیسے ایک شیر خوار بچہ ماں کی چھاتی سے لگ کر دودھ پیتا ہے۔

شام کے دھندلکوں میں کھویا ہوا شہر دھیرے دھیرے رات کی تاریکی کی طرف یوں بڑھتا ہے، جیسے بھاری بوجھ سے لدا ہوا ایک جہاز دھیرے دھیرے سمندر سے ساحل کی جانب آتا ہے۔

شہر کے پیالے میں کتنی خواہشوں کا خون ہے۔ کتنی آرزوؤں کی چمک ہے، کتنی محنتوں کا حساب ہے، کتنے آنسوؤں کی نمی ہے، کتنے ہاتھوں کی گرمی قطرہ قطرہ کر کے دن بھر کی مشقت سے کشمیری ہاتھوں نے اس شب رنگ سیّال کو تیار کیا ہے۔ کوئی دم میں سرینگر یہ پیالہ اٹھا کے پی جائے گا، اور رات کی بانہوں میں سو جائے گا۔ اگلے دن کی امید میں... کیونکہ اگلے دن کی امید نہ ہو تو کوئی شہر نہ بسے، کوئی دریا نہ بہے، کوئی سورج نہ نکلے اور اگلا دن کبھی نہ ملے۔

میں جھیل ڈال کے قریب پلیس ٹوٹل میں ہوں۔ یہ ہوٹل کبھی محل تھا اور اب بھی ہے لیکن اس محل میں اب پرانے مہاراجاؤں کی جگہ نئے مہاراجے قیام کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے شہزادے اور غیر ممالک سے آئے ہوئے صنعتی عہد کے نواب جو رات کی ایک پارٹی میں اتنا روپیہ خرچ کر دیتے ہیں کہ جس سے سرنگر کا ایک پورا محلہ پل سکتا ہے۔ یہ صاحب تیل کے بادشاہ ہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو لوگ انہیں تیلی کہتے اور گھر کے دروازے کے باہر روک دیتے لیکن یہ اب اس محل نما ہوٹل میں در آئے ہیں اور اپنے شاندار سوٹ میں بیٹھے ہوئے پندرہ آدمیوں کو شمپین پلا رہے ہیں، کیونکہ ٹیکساس میں ان کے بیس کنویں ہیں، مٹی کے تیل کے۔ اور کل ہی تار آیا ہے کہ اب اکیسواں دریافت ہوا ہے۔ ان کی مملکت میں اس لئے یہ پارٹی اس زور شور سے جاری ہے اور ان کی فرانسیسی محبوبہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے خوف سے لرز رہی ہے، کیونکہ ان صاحب کا قاعدہ رہا ہے کہ ہر نئے کنویں کی دریافت پر ایک نئی محبوبہ دریافت کرتے ہیں۔ پرانی مثل تھی، نیکی کر اور کنویں میں ڈال۔ آج کی کہاوت یہ ہے۔ نیا کنواں کھودا اور پرانی محبوبہ کو اس میں ڈال۔

یہ امیر عورت گینڈا میں گیارہ رسالوں، دو روزناموں اور پانچ ہفت روزوں کی مالک ہے۔ اس عورت کے پاس عقل نہیں ہے۔ ایک فیتہ ہے جس سے یہ اپنے اخبار اور رسالوں کی تصویریں ناپتی رہتی ہے۔ تصویر جتنی بڑی اور رنگ دار ہوگی۔ رسالہ اتنا ہی زیادہ بکے گا۔ کیونکہ یہ زمانہ

تصویروں کا ہے تصوّر دل کا نہیں ہے اسی فیتے سے یہ اکثر اپنا جسم کبھی ناپا کرتی ہے ناکہ سینہ، کمر اور کولھے کی میزان کہیں غلط نہ ہو جاتے۔ اس لئے یہ عورت فیتہ لیکر ہر وقت اپنے جسم سے لڑتی رہتی ہے ناشتے سے رات کے کھانے تک لڑتی رہتی ہے۔ کسی زمانے میں یہ عورت خوبصورت رہی ہوگی لیکن اپنے جسم سے لڑکر اس عورت نے اپنی فطری خوبصورتی کھو دی ہے۔ فیتے کی رو سے سینہ کمر اور کولھے اندر سے عورت کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے۔ کہیں پر دل کے اندر اس عورت کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے۔ لیکن۔ تلخ حقیقت کا سامنا کرنا نہیں چاہتا اور ہر روز فیتہ لے کر اپنے جسم کو ناپ کر اپنے آپ کو دھوکہ دیتی رہتی ہے۔ یہ عورت بہت امیر ہے۔ اب تک پانچ خاوند بدل چکی ہے مگر فیتے کے سوائے کسی کی وفادار نہ رہ سکی ہے شکر ہیں یہ اپنے نوجوان نیگرو ٹیلر کو لے کر آئی ہے۔ حالانکہ اس کے اخبار اور رسالے سب کے سب اپنی نیگرو دشمنی کے لئے مشہور ہیں اس وقت یہ اپنی سجی ہوئی خواب گاہ میں اپنے ہر رسالے اور اخبار کے ہر گاہک کی نظروں سے دور اپنے نوجوان نیگرو ٹیلر کے ساتھ شراب پی رہی ہے اور اس کے توانا اور تندرست جسم کو یوں دیکھ رہی ہے۔ جیسے قصائی کسی پلے ہوئے بکرے کو دیکھ دیکھ کر اس کے گوشت کا اندازہ کرتا ہے۔ پرانے زمانے ہوتے تو ہم اس عورت کو قصاب کہتے۔ مگر آج کل نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ عورت گیارہ رسالوں، دو روزناموں اور پانچ ہفت روزوں کے ذہن اور فکر کی مالک ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ عورت اپنے ٹیلر کو لے کر ڈال کے کنارے نکل جائے گی اور جھیل کی خوبصورتی کو اپنے فیتے

سے ملے گی۔

یہ حضرت نربدا پاٹرینٹ کے مالک ہیں۔ ہندوستان میں چینی ظروف بنانے کی سب سے بڑی فیکٹری آپ کی ہے۔ ان کے پیالے، طشتریاں، صراحیاں۔ ہر گھر میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر آپ میں ہمت ہے تو انہیں کمہار کہہ کر دیکھئے کھڑے کھڑے نہ بھجوا دیں تو میرا ذمہ! کیونکہ پولیس سے وزیروں تک سب ان کے دوست ہیں۔ اور انہی کی چینی کی پلیٹوں میں ان کا نمک کھاتے ہیں۔ انھوں نے کسی سے سن لیا تھا کہ کشمیر کی وادی میں ایک خاص طرح کی مٹی پائی جاتی ہے جس سے چینی کے ظروف بہت عمدہ بن سکتے ہیں۔ نربدا پاٹرینٹ سے بھی عمدہ۔ اس لئے یہ آدمی ڈیڑھ ماہ سے پیلس ہوٹل میں مقیم ہے اور حکومت سے جھیل ڈل کو خشک کرنے کی اجازت مانگتا ہے۔ کیونکہ اس کے انجینیروں نے کشمیر کی مختلف وادیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد اسے بتایا ہے کہ چینی ظروف بنانے کے لئے جھیل ڈل کی تہہ کی مٹی سب سے عمدہ ہے۔ وہ اس کام کے لئے دو کروڑ روپے خرچ کر دینے کو تیار ہے۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت برابر انکار کیوں کر رہی ہے۔ اس کی نگاہوں میں ڈوبتی ہوئی شام کے شفقی لہریئے نہیں ہیں۔ سطح آب پر ڈولتے ہوئے گلابی کنول نہیں ہیں اور کسی مصور کے خیال کی طرح سجے ہوئے شکارے نہیں۔ وہ بار بار پیلس ہوٹل سے بھاگ بھاگ کر جھیل ڈل کے کنارے آتا ہے اور سینہ پیٹ پیٹ کر کہتا ہے، ہائے ہائے یہ جھیل ڈل کی کیچڑ مجھے کیوں نہیں مل سکتی؟

یہ ایک فلم پروڈیوسر ہے، اپنی پچھلی فلم میں اس نے دارجلنگ کو

استعمال کیا تھا اور دس لاکھ روپے کمائے تھے۔ اس فلم میں وہ سری نگر کو استعمال کرے گا اور پندرہ لاکھ روپے کمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سری نگر کے مناظر بہت خوبصورت ہیں۔ جھیل ڈل اور چشمہ شاہی اور نشاط باغ اور شالیمار اور ہارون لیک اور وہ سب کو استعمال کرے گا۔ ایک پس منظر کی طرح اور اپنی ہیروئن کے حسن کو اجاگر کرے گا۔ یہ پروڈیوسر حسن بیچتا ہے۔ مگر آپ اسے بازار حسن کا دلال نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس کا بنک میں چالیس لاکھ نقد پڑا ہے۔ اس کے اسٹوڈیو میں دو ہزار آدمی کرتے ہیں اور اس کے پاس تازہ ترین ماڈل کی شیورلیٹ گاڑی ہے۔ بلیک سے اس کی تجوریاں بھری پڑی ہیں اور صرف دہاٹ ہارس وہ پیتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سری نگر کی اس جوان اور حسین رات میں وہ کس طرح اپنی فلم کے ہیرو کو چل دیکر ہیروئین کو اپنے ساتھ لے کر اس چاندنی رات میں ڈل کی سیر کو نکل جائے اور ہیروئن اپنی جگہ پریشان ہے کیونکہ جھیل ڈل میں دو جزیرے ہیں۔ ایک کو کشمیری زبان میں سونے کا جزیرہ کہتے ہیں۔ دوسرے کو چاندی کا جزیرہ، اور ہیروئن نے آج رات پروڈیوسر کے ساتھ سونے کے جزیرے میں جانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور ہیرو کے ساتھ چاندنی کے جزیرے میں۔ اور اب وہ دونوں اسے لینے آئے ہیں۔ ایک طرف فلم پروڈیوسر، دوسری طرف ہیرو، اور ہیروئن بیچاری حیران ہے۔ وہ کبھی سونے کے جزیرے کو دیکھتی ہے کبھی چاندی کے جزیرے کو اور فیصلہ نہیں کر پاتی کہ وہ آج کی رات کس کی باہوں میں رہے گی۔ !

اس طرح ہوٹل کے کتنے ہی کمرے ہیں اور سوئٹ ہیں اور لاؤنج ہیں جن میں کوئی نہ کوئی سیٹھ الجھا ہوا ہے۔ بظاہر ہنسی چل رہی ہے۔ لیکن اندر ہی اندر کوئی اور کشمکش چل رہی ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کیا ہو۔ کیونکہ یہ لوگ کچھ گنوا نہیں سکتے۔ کچھ کھو نہیں سکتے، کسی طرح اپنے کسی نقصان پر آمادہ نہیں کیے جا سکتے۔ بظاہر یہ لوگ کشمیر کی سیر کو آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سوں کے لئے کشمیر ایک پس منظر ہے ایک فیتہ ہے، کیچڑ ہے۔ سونے کے لئے ایک جزیرہ ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہر سال سری نگر آتے رہیں گے اور سری نگر کی راتوں میں رنگ رلیاں منا کر بھی سری نگر کی رات کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ کیونکہ ہر روز سری نگر کی لیلیٰ شب تاریک کا لبادہ اوڑھ کر نکلتی ہے اور صرف وہی اس کی نقاب الٹ کر دیکھ سکتا ہے جو اپنے دل کی نقاب الٹ سکتا ہے۔

اس لئے میں گھبرا کر ہوٹل سے باہر نکل کر آتا ہوں اور رات کے سناٹے میں ڈل کے پھولوں کی چاندنی میں نہاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

بہت دن گزرے اسی ڈل کے پانیوں میں ایک انگریز سپاہی نے خودکشی کی تھی۔ کیونکہ اسے اپنے میجر کی لڑکی سے محبت تھی۔ دونوں انگریز تھے۔ دونوں سفید فام تھے دونوں ملکوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر بھی ان کے تعلق باہمی کو کسی نے تکمیل پہنچانے نہ دیا۔ کیونکہ ایک میجر کی لڑکی تھی دوسرا محض ایک سپاہی تھا اس لئے شادی کسی طرح نہ ہو سکی۔

اس لئے دیکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ ایک رات ایسی ہی چاندنی میں وہ دونوں محبت کے مارے ایک شکارے کو کھینچتے ہوئے جھیل ڈل میں آئے کبھی

محبوبہ کشتی کھینچتی تھی اور عاشق گٹار پر کوئی مہجور گیت سناتا تھا۔ کبھی عاشق بجاتا تھا۔ اور محبوبہ شکارے کے سرخ گدوں پر اپنی سیب کی ڈالیوں ایسی باہیں ٹکائے غور سے اس کی طرح دیکھتی جاتی تھی۔ ڈل کے بیچ جا کے چپو چھوڑ دیئے گئے اور دیر تک وہ دونوں ہوا کی سرگوشیوں کی طرح ایک دوسرے کے سانس کی لذت سے آشنا ہوتے رہے اور دیر تک نیلوفر کے پھول، سطح آب پر آنکھیں کھولے سہم کر ان دونوں کی طرف دیکھتے رہے۔ کیونکہ پھول محبت کے سب انداز جانتے ہیں.... اور اس کے ہر انجام سے واقف ہوتے ہیں۔

یکایک وہ دونوں ڈولتی ہوئی کشتی میں پھولوں کے درمیان اٹھ کھڑے ہوئے۔ میجر کی لڑکی نے آہ بھر کر اپنی دونوں باہیں اس معمولی سپاہی کی گردن میں ڈال دیں۔ سپاہی نے اسے اپنی باہنوں میں اٹھا لیا۔ اور ڈل کے پانی میں کود گئے

کشتی زور سے ہلی اور جب دونوں جسم گرے تو پانی کی سمگیں سطح لاکھوں ستاروں میں ٹوٹ گئی اور نیلوفر کے پھول ڈوب گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ابھر آئے۔ مگر وہ پھول ڈوب کر نہ ابھرے۔ جن کی محبت کو کسی نے پھول کی طرح کھلنے نہ دیا تھا۔ دوسرے دن

بیچ نیچے ڈل میں دور، دور تک تیراک اور غوطہ خور بھیجے۔ لیکن کوئی ان کی لاشیں دریافت نہ کر سکا۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دونوں عاشق اب بھی زندہ ہیں اور سونے کے جزیرے کے کنارے جہاں بید مجنوں کے درخت، بیواؤں کی طرح بال کھولے، پانی پر جھکے ہوئے روتے ہیں۔

ان کے آنسوؤں کی پناہ میں زور، زرد آنکھوں والے کنوؤں کے نیچے گہری نمی تہہ در تہہ آبی گھاس کے نیچے سفید سفید گھونگھوں کے کسی محل میں. وہ دونوں محبت کرنے والے دنیا کی نظروں سے دور آج بھی کہیں رہتے ہیں۔

اور کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ بھری چاندنی رات میں جب سب سو جاتے ہیں۔ جب ڈل کے کنارے کوئی متنفس نہیں گھومتا۔

جھیل کی تہہ آب سے

ایک شکارہ نکلتا ہے۔ جس کی لکڑی بید مجنوں کی ہوتی ہے۔ جس کے چپو کنول کے پھولوں کے ہوتے ہیں اور بڑے آبی گھاس کے سبز لہریوں کی طرح ہوا میں جھولتے ہیں۔ اس شکارے میں کوئی اپنی کھلی ہوئی جامد آنکھوں سے کسی کو تکتا ہوا گٹار پر ایک مدھم اجنبی گیت گاتا ہے اور کوئی سیپ کی ڈالیوں ایسی باہیں شکارے کے گدوں پر ٹکائے غور سے اس گیت کو سنتی جاتی ہے اور شکارہ آپ نشاط باغ کی طرف چلتا جاتا ہے۔

بہت سے لوگوں نے اس کشتی کو دیکھا ہے اور اس رات پیلس ہوٹل سے نکل کر میں نے اس کشتی کو دیکھا۔

چاندنی رات کے بساط سناٹے میں یہ کشتی گویا چاند کی کرنوں سے بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مرد کی دونوں آنکھیں کھلی تھیں اور دونوں چپو ساکت تھے۔

عورت کی دونوں آنکھیں اپنے مرد پر تھیں اور اس کا رخ بدلنے والا کنول کی شکل کا چپو ایک بچے کی طرح اس کی گود میں تھا اور وہ دونوں ایک عجیب محویت کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور کشتی آپ ہی آپ پانی کی لہروں پر ڈولتی ہوئی امیرا کدل کی جانب چلی جا رہی تھی۔ اور کشتی میں بہت

سا سامان بھرا تھا۔ لکڑیاں اور سبزی کی ٹوکریاں اور کنول کے پھول اور ایک بکری جو بار بار چاند کی طرف منہ کر کے خوشی سے ممیاتی ہے۔

یکایک مرد نے ایک کشمیری گیت گانا شروع کر دیا۔

"ژکیو سونیہ حیا نہ بھرم دکھ . . . . ."

مجھے معلوم نہیں ہے۔

میرا رقیب کون ہے،

جس نے تیری توجہ مجھ سے کر لی ہے۔

جس کی وجہ سے تو نے مجھ سے نگاہیں پھیر لی ہیں۔

آواز کی لہک میں ایک عجیب سوال تھا۔ اسے محسوس کر کے یکایک کشمیری عورت نے شرم سے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ شرم سے اس کے گال تمتا گئے اور اس کے کانوں میں پڑی ہوئی چاندنی کی بالیوں کے گچھے ایک نرم و نازک جواب کی طرح بج اٹھے اور میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ یہ تو وہ کشتی نہیں ہے، یہ تو وہ لوگ نہیں ہیں۔ یہ تو سری نگر کے دو عالم لوگ ہیں۔ دن بھر کی محنت سے چور ہو کر گھر جاتے ہوئے ان لوگوں کو خودکشی کہاں راس آئے گی کیونکہ یہ لوگ محبت بھی کرتے ہیں اور محنت بھی ---!

میں بند پر چل رہا ہوں۔
میرے ساتھ جہلم بھی چل رہا ہے۔
ہم دونوں مسافر ہیں اور بہت دور سے آئے ہیں۔
جس دن میری ماں نے مجھے جنم دیا میں بہت کمزور تھا۔
جس دن چینہ دیری ناگ نے جہلم کو جنم دیا وہ بھی بہت کمزور تھا۔

مگر وہ آگے چلا اور اس میں ندی نالے آ کے ملتے گئے۔
میں آگے چلا اور مجھ میں دن رات ملتے گئے۔
پھر ہم دونوں زندگی کی چٹانوں پر گھسٹتے گئے اور حالات کی کھائیوں میں آبشار بن کر گرے۔ ہم نے کھیتوں کو سیراب کیا اور پھولوں کی خوشبو سونگھی۔

ہم نے شہروں کا کوڑا کرکٹ اٹھایا اور اسکا تیزاب اپنے سینے میں گھول لیا اور انسان کی مایوسی کی طرح گدلے ہو گئے۔

ہم نے لوگوں کے درمیان پل باندھے اور کشتیاں چلائیں اور پانی کے ہاتھوں سے مصافحے کئے اور ہم ساری دنیا پر پھیل گئے۔

جہلم ایک انسان ہے۔
انسان ایک دریا ہے۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان دونوں کے ساتھ رات کھنچے
چلتی ہے۔

"بابو!"
میرے کانوں میں ایک آواز آئی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ چلتے چلتے رک گیا ہو۔ میں نے مڑکر دیکھا ایک بڈھا کشمیری پنڈت جو نازک خد و خال والا ایک میلا فرن پہنے، بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک میلی سی چادر کھولے بیٹھا ہے۔
"کیا ہے!" میں نے اس سے پوچھا۔
"اصلی کرپش لازولی کی مالا ہے۔ اصلی نیلم کی انگوٹھی ہے۔ اصلی جیڈ کا ایش ٹرے ہے۔ اصلی مونی اسٹون کی انگوٹھی ہے۔"
"ہر چیز اصلی ہے اور تم اسے یوں سمندر کے کنارے بیٹھے بیچتے ہو۔!"
"ہاں۔" بڈھے نے کہا۔ "یہ نوادرات سستا ہیں بابو، کوڑیاں کے

مول بیچتا ہوں۔ انھیں لداخ کا ایک لامہ لایا تھا۔!"
"خوب! ذرا دکھاؤ تو!"
بڈھے کشمیری پنڈت نے اپنی چادر کھولی۔
بنی ہوئی چاندی کی انگوٹھی تھی۔ نگ گھٹیا قسم کے مون اسٹون کا تھا۔ خاکدان کا جید بھی گھٹیا تھا۔ لاپس لازولی بھی تیسرے درجے کا تھا۔ مگر کاریگری اعلیٰ درجے کی تھی۔ ہر چیز ترشے ہوئے ہیرے کی طرح چمک رہی تھی۔ مجھے خاص طور پر انگوٹھی پسند آئی تھی اس لئے میں نے اس کی طرف سے نگاہ اٹھالی اور دوسری چیزوں کی قیمت پوچھنے لگا۔ یہ جیڈ خاکدان کتنے کا ہے۔؟"
"ایک سو ستر روپیہ!"
"ہوں! اور یہ لاپس لازولی کی مالا!"
"نوے روپے!"
"ہوں! اور یہ نیلم کی انگوٹھی؟"
"چارسو!"
"اور یہ ـــ! یہ جلی ہوئی چاندی کی انگوٹھی۔؟ میں نے لاپرواہی سے چاندی کی انگوٹھی کے بارے میں پوچھا۔
"یہ مون اسٹون کی انگوٹھی؟ ـــ چالیس روپئے کی ہے! یہ

تبت کی لامہ کی ہے۔!"

"ابھی ابھی تم لدّاخ کے لامہ کی بات کر رہے تھے۔"

"تبت کے لامہ سے چرا کر کوئی اس کو لدّاخ لے گیا تھا۔ وہاں سے ایک لامہ میرے پاس لایا۔ میں نے اس سے خرید لیا۔ اس انگوٹھی کو۔!"

"میں اس کے دس روپے دوں گا۔"

"اکیلا اس کا نگ چالیس روپئے کا ہوگا۔ میں تو اپنے خاندان کے نوادرات بیچ رہا ہوں۔!"

میں چلنے لگا۔

وہ بولا۔" اچھا تیس روپے دے دو!"

میں نے کہا" اب آٹھ دوں گا۔!"

"تم تو مذاق کرتے ہو۔" بڈھا بولا" چلو بیس دیدو!"

میں نے آگے کو قدم بڑھائے اور چلنے لگا۔ پھر اکہ بڈھا آواز دینے لگا۔

"اچھا پندرہ روپے دے جاؤ..... چلو بارہ پر سودہ کرلو۔ اچھا واپس آجاؤ۔ چلو دس ہی دے جاؤ!"

میں نے واپس آکر کہا۔

"اب سات دوں گا۔!"

میں نے جیب سے سات روپے نکال کے مون اسٹون کی انگوٹھی لے لی اور پھر پوچھا۔

"کیا یہ پتھر اصلی ہیں۔؟"

"پتھر تو سب نقلی ہیں، بڈھے پنڈت نے آہ بھر کر کہا۔" مگر ان پر جو محنت کی گئی ہے، وہ سب اصلی ہے!"

"تو تم ایک قیمت کیوں نہیں بتاتے ہو!" میں نے اس سے پوچھا۔

"چالیس سے شروع کرتے ہو، سات پر آجاتے ہو، ایسا کیوں کرتے ہو۔؟"

"گاہک کو جھگڑے میں مزہ آتا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کو، عیار پنڈت نے مجھ سے آنکھ مار کر کہا۔" وہ سمجھتی ہیں انہوں نے کوڑیوں کے بھاؤ ہیرے خرید لئے ہیں۔!"

میں ہنس کر آگے بڑھ گیا۔

دور آگے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ بند کے نیچے ڈھلان پر دریا کے کنارے ایک نوجوان ایک جوان عورت کو مار رہا ہے۔ بڑی سختی اور بے رحمی سے۔ قریب میں چولھے میں آگ جل رہی ہے اور اس میں توا رکھا ہے اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت مکئی کی روٹیاں توے سے اتار کر چولھے میں سینک

رہی ہے۔ ایک بڑھا اور ایک لڑکا تھالی آگے رکھے مکئی کی روٹی کدو کے سالن کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ دو نوجوان انڈوں کی ٹوکریاں رکھے اطمینان سے انڈے گن رہے ہیں۔ ایک آدمی دریا میں اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں سے کیچڑ چھڑا رہا ہے اور آدمی گھونسوں اور لاتوں سے اس نوجوان عورت کو مارے جا رہا ہے اور عورت زور زور سے مدد کے لئے چیخ رہی ہے مگر کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔

میں بندر سے اتر کر اس عورت سے پوچھنے لگا۔ جو توے پر مکئی کی روٹی ڈال رہی تھی اور اسے بتانے لگا۔

"وہ ایک آدمی ایک عورت کو پیٹ رہا ہے!"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

پھر تم عورت ذات ہو کر دوسری عورت کو بچاتی نہیں؟"

"وہ اس کا مرد ہے، وہ اس کی عورت ہے۔"

میں اس مرد کے پاس پہنچا "تم اسے مارتے کیوں ہو؟"

"یہ میری عورت ہے!" اس نے عورت کے گال پر زور کا طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا "بتا یہ چاندی کا چھلا کہاں سے آیا؟" اس نے ایک اور لات جمائی۔

"کون سا چھلا؟" "ہڑو، ہڑو۔" میں نے کہا۔

وہ رک کر کہنے لگا یہی جو یہ پہنے ہوتے ہے۔"

چاندی کا چھلا کونسی ایسی بڑھیا چیز ہے۔ ممکن ہے اس نے خرید کر پہن لیا ہو۔" میں نے کہا۔ ممکن ہے اس نے تین چار روپے بچا رکھے ہوں کونسی ایسی بڑی بات ہے۔ یہ دیکھو میں نے سات روپے میں یہ چاندی کی انگوٹھی خریدی ہے!"

اس آدمی نے اپنی بیوی کو مارنا بند کر دیا۔ اپنے دو ہاتھ کمر پر رکھ کر بولا۔

"بابو تمہاری بات دوسری ہے، تم سات کیا ساٹھ روپے کی انگوٹھی بھی خرید کے پہن سکتے ہو۔ یہ کہاں سے لائے گی؟ ہمارا سارا خاندان دن رات بلڈنگ پر اینٹیں ڈھو کے بس اتنا کماتا ہے کہ دو وقت کا گذارہ ہو سکے۔ اتنے میں چاندی کا چھلا کہاں سے آئے گا۔؟ کل تک اس کی انگلی میں نہیں تھا۔ آج کہاں سے آگیا!"

"یہ کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے راستے میں پڑا مل گیا تھا۔ حرامزادی چھنال، بول، بول کس یار سے لائی ہے۔"

مرد نے عورت کے منہ پر مکا مار کے کہا اور عورت کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا... اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی اور چاندی کا چھلا اس

کی انگلی سے نکل کر دریا میں ڈوب گیا۔

"ہائے!" عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

مرد نے عورت کا ماتا بند کر دیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے روٹی پکانے والی عورت سے پوچھا۔ "تم لوگ مجھے سری نگر کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے!"

"ہم راجوری سے آئے ہیں۔!" روٹی پکانے والی عورت بولی ادھر ہمارا جو کچھ تھا وہ سب بک گیا۔ اس لئے ہم یہاں آگئے ہیں۔ ادھر بلڈنگ پر کام کرتے ہیں۔ اینٹیں ڈھوتے ہیں۔ میرے دو لڑکے انڈے بیچتے ہیں۔ یہ جوار رہا ہے یہ میرا لڑکا ہے وہ جوار کھا رہی ہے وہ میری بہو ہے۔ یہ بڈھا میرا خصم ہے، یہ جو اس کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے یہ میرا پوتا ہے ہم لوگ کی ادھر راجوری میں اچھی حالت تھی۔ مگر پھر جو تھا سب بک گیا۔

اور جو باقی تھا۔ وہ سنگر میں آکے بک گیا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ مگر وہ میری بات نہیں سمجھی۔ اس لئے میں نے بات بدل کر اس سے کہا۔

"ایک مکئی کی روٹی کتنے پیسوں میں دو گی۔!"

اس نے مجھے شبہہ کی نظروں سے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

میں نے کہا۔ بات یہ ہے ماں۔ کہ مدت سے مکئی کی روٹی اور کدو کا سالن نہیں کھایا ہے۔ جی چاہتا ہے ایک مکئی کی روٹی اور کدو کا ساگ ویدو ایک روپیہ دوں گا۔"

" بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ!"، بڈھا جلدی سے بولا۔

میں نے ایک روپیہ نکالا، بڈھے نے ہاتھ بڑھایا۔ مگر جلدی سے اس لڑکے نے وہ روپیہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور اپنی جیب میں ڈال کر بولا۔

" مائی اسے کدو روٹی دے اور چلتا کر۔"

پھر وہ اپنی بیوی کو جواب ہوش میں آ چکی تھی، ایک گھونسہ مار کر بولا۔ " چل آ کے پاؤں چھو ماں کے، معافی مانگ اور بول پھر کبھی ایسا چھلا نہیں پہنے گی۔

بہو نے ساس کے پاؤں چھوتے آگ کے سامنے ہاتھ کر کے قسم کھائی کہ آئندہ وہ کبھی ایسا چھلا نہیں پہنے گی۔ مگر وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اور اس کی نگاہیں بار بار میری مون اسٹون کی انگوٹھی پر رک جاتی تھیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر یہ لڑکی ایسی ہی خوبصورت رہی اور اسی طرح غریب تو وہ چاندی کا چھلا دوبارہ پہنے گی، مگر اس وقت میں خاموش رہا۔

میں نے مکئی کی گرم روٹی اپنے ہاتھ پر رکھ لی اور روٹی پر ماں نے کدو کا سالن ڈال دیا اور میرے نتھنوں میں کدو کے سالن کی گرم گرم بھاپ پہنچنے لگی اور روح میں سنہری مکی کی روٹی کا سوندھا پن اترنے لگا۔

"مارٹن یا ترین۔؟"

"سوپ کو نسا لیں گے!"

"پاس دی سالٹ پلیز!"

. . . . . .

میں نے لقمہ توڑ کر نوجوان مارنے والے سے پوچھا۔ "کبھی پیلس ہوٹل گئے ہو!"

"آج تک کسی ہوٹل میں نہیں گیا!"

"چشمہ سازی دیکھا ہے؟"

"نہیں!"

"نشاط باغ!"

"نہیں، کیوں! وہاں کوئی کام ملتا ہے۔"

"کام نہیں ملتا ہے۔ تفریح ہوتی ہے!"

"تفریح کیا ہوتی ہے؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

میں جواب کیا دیتا۔ اس لئے چپ ہو رہا۔ جب مکئی کی روٹی کا آخری

لقمہ توڑ رہا تھا تو میں نے پوچھا۔ مہینے میں کتنی بار بیوی کو پیٹتے ہو؟"

"یہی کوئی پانچ چھ بار۔ وہ نوجوان اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ کیوں جانکی؟"

اور جانکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

آدھی رات کے وقت جہلم کی سطح پر تیرتے ہوئے ہاؤس بوٹوں کی بتیاں گل ہو چکی تھیں۔ شکاریوں اور کشتیوں کی آمد ورفت بھی بند ہو گئی تھی۔ بند کے آس پاس سفیدے کے درخت سپاہیوں کی طرح اٹینشن کھڑے تھے۔ مانجھیوں کی صدائیں گم تھیں۔ شکاروں کے چپو خاموش تھے۔ برستی ہوئی چاندنی میں بجلی کے کھمبوں کے بلب کسی اندرونی دکھ اور اندوہ سے جلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میں امیرا کدل کے پل پر کھڑا تھا اور میرے نیچے جہلم بہہ رہا تھا۔

ایسے میں وہ امیرا کدل کا سفید ڈاڑھی والا لنگڑا قادر بٹ میرے سامنے وارد ہوا اور میری طرف دیکھ کے ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنستے ہو؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

وہ فوراً سنجیدہ ہوگیا۔ پھر دیر تک مجھے پل پر کھڑا گھورتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا۔" اس شہر میں کتنے پل ہیں؟"

"سات ہیں۔"

"نام گناؤ۔!"

میں نے نام گنا دیئے:" امیرالدل، حبہ الدل، فتح کدل، زینہ کدل سالی کدل اور صفا کدل۔!"

مگر دو پل اور بنے ہیں۔"

"ہاں۔!"

"ان کے نام بتاؤ۔!"

"مجھے معلوم نہیں۔!"

"کل کتنے ہوئے۔"

"نو پل!" میں نے تنگ آکر کہا اس پگلے سے کہا۔ سری نگر اب نو پل کا شہر ہے۔"

"مگر دسواں پل کہاں ہے؟"

"دسواں پل کونسا دسواں پل۔! میں نے حیران ہوکر اس سے پوچھا۔

مگر پگلے نے جواب نہ دیا۔ وہ دیر تک مجھے دیکھ کر ہنستا رہا۔ پھر یکایک گھوم کر امیر اکدل کے پار ہری سنگھ اسٹریٹ کی طرف چلا گیا۔ زور زور سے چلاتے ہوئے بولا۔ "دسواں پل کہاں ہے، دسواں پل کہاں ہے؟"

وہ شہر کے مختلف محلوں میں یہ صدا لگاتے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس پگلے کی صدا پر کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ پگلے تارڑ بٹ کو شہر میں اکثر لوگ جانتے تھے وہ صفا کدل میں لکڑیاں چیرنے کا کام کرتا تھا۔ دن بھر لکڑیاں چیرتا تھا اور شام کو ساتوں پل پار کر کے امیر اکدل کے ایک ہوٹل میں لکڑیاں پہنچانے جاتا ہے۔ اس کی لکڑیوں سے بھری ہوئی کشتی ہر روز جہلم کی سطح پر ساتوں پلوں کے نیچے سے گزرتی تھی اور وہ اسے بڑی جانفشانی اور تندہی سے کھیلتا ہوا کشتی کی پوری کھیپ لکڑیوں کی ہوٹل میں پہنچا کے رات گئے نو دس بجے ٹال پر واپس پہنچتا ہے اور مالک سے دن کی محنت کے ڈھائی روپے وصول کر کے گھر جاتا تھا۔ گھر جا کر وہ اپنی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتا تھا اور پھر ایک پیالہ شیرہ چائے کا پی کر بے سدھ سو جاتا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے شدید محبت کرتا تھا اور پھر ایک پیالہ

اور اس کی محبت کا دیوانہ پن سارے علاقے میں مشہور تھا ایک بار اس کی بیوی ہیضے سے بیمار ہو گئی اور وہ ٹال والے سے قرض لیکر حکیم کی دوا لایا اور بیوی کو دوا کھلا کے لکڑیوں کی ٹال پر چلا گیا۔ دن بھر وہ

لکڑیاں چیرتا اور بیچ بیچ میں بھاگ بھاگ کر اپنی بیوی کی تیمار داری کے لئے جاتا رہا۔ عجیب مصیبت تھی بیوی کی تیمار داری بھی ضروری تھی اور لکڑیوں کی چرائی بھی ضروری تھی اور انھیں ہوٹل پہنچانا بھی ضروری تھا۔

دن بھر جب بیوی کی قے کسی طرح نہ رکی تو اس نے ٹال والے سے ڈاکٹر کی دوا دارو کے لئے دس روپے مانگے۔ ٹال والے نے کہا کہ وہ جب ساری لکڑیاں چیر کر کشتی میں بھر کر امیرا کدل کے ہوٹل میں پہنچا کر واپس نہ آئے گا وہ اسے دس روپے نہیں دیگا۔

"نادر بخش بھاگا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ لوگ کہتے ہیں اس وقت قے اور جلاب سے اس کی بیوی آدھ موئی ہو چکی ہے اور تقریباً مردہ نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنی بے ہوش بیوی کے ٹھنڈے پسینے سے تر بتر ماتھے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔

"جہنب خاتون تو مرنا نہیں۔ میرا انتظار کرنا سمجھی، میرا انتظار کرنا، میں ابھی امیرا کدال میں لکڑیاں پہنچا کے اور راگر لی۔ دوا والے ڈاکٹر کو لے کے تیرے پاس آتا ہوں۔ پھر تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ سمجھی! دیکھ مرنا نہیں۔ میرا انتظار کرنا۔"

اپنی بے ہوش بیوی سے اتنا کہہ کر نادر بٹ وہاں سے رخصت ہوا اور جلدی جلدی لکڑیاں کشتی میں بھر رخصت ہوا۔ اس سے پہلے اسے جہلم کا راستہ کبھی اتنا لمبا اور دشوار گذار معلوم نہ ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ دریا نہیں ہے صحرا ہے۔ جس میں ہر لحاظ اس کے قدم دھنسے جا رہے تھے۔ وہ بڑی شفقت سے چپو چلا رہا تھا۔ اور ایسی تیزی سے جیسے کوئی بھری کپتان اس کی پیٹھ پر چابک

لئے کھڑا ہو۔ زندگی میں آج تک اس نے کبھی جہلم کے ساتویں پل کو نہیں دیکھا تھا۔
آج اس نے اپنے سر پر سے گزرتے ہوئے ہر پل کو اس طرح گنا اور محسوس کیا، جیسے ظلم کی ایک بڑی محراب اس پر قائم ہو، اور وہ اپنے جسم و جاں کی پوری قوت سے چیخ چلاتا ہوا اپنے راستے کے سارے پلوں سے گزر کر ہوٹل میں لکڑیاں دیکھ واپسی پر شال والے سے دس روپے لیکر دور ڈاکٹر احمد یار خاں کو لے کر جب اپنی بیوی کے سرہانے پہنچا تو زینب مر چکی تھی، پلوں کے پار جا چکی تھی۔

سری نگر میں سات پل تھے، وہ چلا چلا کر لوگوں سے پوچھتا تھا۔ "آٹھواں پل کہاں ہے؟ جب آٹھواں پل بن گیا تو وہ چلا چلا کر پوچھنے لگا۔ نواں پل کہاں ہے؟ جب نواں پل بن گیا تو وہ پوچھنے لگا، دسواں پل کہاں ہے؟ پگلا جوہرا، اس کی بات میں کوئی تک نہیں!

آجکل پگلے قادر بٹ کی آواز رات کی تنہائیوں میں سری نگر کے مختلف محلوں اور کوچوں میں سنائی دیتی ہے۔ میرے کانوں میں اس وقت وہی آواز گونج رہی ہے۔ دسواں پل کہاں ہے؟ دسواں پل کہاں ہے۔

جہلم شہر ان حصوں سے گزر رہا ہے جہاں سیاح کبھی نہیں جاتے۔ جہاں دو روپیہ ماں دا سیاب سے لدی ہوئی کشتیاں کھڑی ہے اور اونچی پرانی حویلیوں کی چھتوں پر پھول اگے ہوئے ہیں، جہاں مکانوں کی غلاظت سیدھی دریا میں گرتی ہے اور ننگ گلی کوچوں کی کھلی ہوئی موریاں اپنا سارا تعفن دریا میں انڈیل دیتی ہیں۔

زینہ کدل میں کہیں ماچھیوں کے گھروں سے حبہ خاتون اور رسول میر

کے گیتوں کی صدا آتی ہے۔ رعنا داڑی میں اخروٹ کی لکڑی پر چنار کے خوبصورت پتوں کے نقش و نگار اجاگر ہو رہے ہیں۔ امیرا کدل میں شالوں پر ایسی باریک سوزن کاری ہو رہی ہے کہ چاندی کی کرنیں بھی دیکھیں تو شرما جائیں۔ جڈی پل کے مضافات میں یہ منظور الٰہی کا گھر ہے۔ پھوس کی چھت اور کچی سلی کی اینٹیں اور ایک ہی کمرہ ... رات کے دو بجے ہیں اور منظور الٰہی ابھی تک اپنے کام میں مصروف ہے۔ وہ پیپر ماشی کی ایک بڑی صراحی بنا رہا ہے اور اس پر آخری نقش و نگار اجاگر کر رہا ہے۔ صراحی کیا ہے خیام کی رباعی معلوم ہوتی ہے۔ ایک کونے میں اس کی بیوی زیورات رکھنے کے لئے پیپر ماشی کا بکس تیار کر رہی ہے۔ سنہری اور سبز محرابوں کے اندر نازک نازک سپید جالیاں تاج محل کی جالیوں کی طرح تراش اور منقش معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہ سنگِ مرمر نہیں ہے۔ محض پیپر ماشی ہے۔

منظور الٰہی میرا دوست ہے اس لئے میں بے تکلف اس کے کمرے میں چلا جاتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں "اس وقت رات کے دو بجے ہیں، کب سوؤ گے۔؟"

"جب انگلیاں چلنے سے انکار کر دیں گی۔ وہ کہتا ہے۔

میں تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہتا ہوں۔ بھابی۔ شیر چاء پلاؤ۔!"

بھابی سماوار سے گرم گرم شیر چاء کا ایک پیالہ نکال کر مجھے دیتی ہے۔ چاء گاڑھی اور سرخ ہے اور سوڈے سے نمکین بھی ہے۔ عجب مزا ہے اس شیر چائے کا۔

"۔ پیرا ایک وسکی لاؤ۔!"

" ڈارلنگ ایک بار پھر اور۔ ابھی تمہاری آنکھوں کا نشہ گہرا نہیں ہوا ہے!"

ٹیبلرسب کے جام شمپئن سے بھر دو۔ میں تجویز کرتا ہوں، ایک جام۔

. . . .

میں پوچھتا ہوں، منظور الہیٰ کبھی پیلیس ہوٹل گئے ہو۔!"

اکثر جاتا ہوں، کل بھی جاؤں گا۔ یہ صراحی اور زیورات کے صندوقچے کا آرڈر وہاں کا ہے۔ صاحب کل لندن جا رہے ہیں، اس لئے یہ کام آج ہی ختم کر دینا ہوگا۔

میں اس کمرے کے چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ زرد مٹی کی دیواریں۔ کچا فرش۔ ایک طرف مٹی کے دو گھڑے، ایک طرف دو چارپائیاں۔ ایک طرف چولھا اور چند برتن۔ ایک طاقچے میں کانگڑی رکھی ہوئی ہے۔ ایک طاقچے میں دواؤں کی بوتلیں ہیں۔ ہوا میں بدبودار پانی کی رطوبت رچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ڈھیرے سے منظور الہیٰ کی بیوی کھانستی ہے تو اسکا سارا جسم کسی پرانے لکڑی کے پل کی طرح ہلتا معلوم ہوتا ہے۔

"سب ختم ہے۔"

"کیا۔؟ میں منظور الہیٰ سے پوچھتا ہوں۔"

" اس صراحی کا کام۔؟ منظور الہیٰ مجھے صراحی دکھاتا ہے۔ اس نیم تاریک کمرے کی روشنی کے ہالے میں لے جا کر وہ مجھے صراحی دکھاتا ہے۔ یکایک خوشنما رنگوں سے منقش صراحی کسی بلوریں فانوس کی طرح روشن ہو جاتی ہے۔ میں اس کے پیکر جمیل کو دیکھتا ہوں جاتا ہوں۔ کیا انسانی انگلیوں سے ایسی خوبصورتی

نازکی اور رعنائی کی تخلیق ممکن ہے!

میں حیرت سے اس کمرے کی ننگی دیواروں کو دیکھتا ہوں اور اس حسین صراحی کو دیکھتا ہوں اور دیکھتا رہ جاتا ہوں

"بس اتنی سی جگہ بچی ہے، ایک شعر لکھنے کے لئے!"، منظور الٰہی مجھ سے صراحی پر منقش ایک محراب کی طرف اشارہ کر کے بتاتا ہے۔ یہاں ایک لکھوں گا، کوئی اچھا سا شعر بتاؤ۔!

میں کبھی اس کی صراحی کو دیکھتا ہوں۔ کبھی منظور الٰہی کے منہ کو، کبھی اپنی بھابی کو کبھی اس کمرے کو اس کی دیواروں کو اس کی پھولس کی چھت کو، اور دھیرے سے کہتا ہوں۔

گریز دا ز صفت ما ہر کہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ما نیست

"ہاں بالکل ٹھیک ہے! منظور الٰہی سر ہلا کر کہتا ہے۔ پھر ہولے ہولے صراحی پر شعر لکھتے ہوئے پوچھتا ہے۔

"کس کا ہے!"

"نظیری نے کہا تھا۔ آج سے تین سو سال پہلے"،

بالکل ٹھیک! بھابی کہتی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں رات گذرتی جاتی ہے۔ جہلم بہتا جاتا ہے۔ ایسے میں کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے سارے کپڑے پھاڑ دوں اور ننگے "نادر بٹ" کی طرح زور زور سے چلا چلا کر پوچھوں وسوال بل کہاں ہے! کہاں ہے وہ شراب منت رنگ آرزوؤں کی امیدوں کی بہاروں کی جو جھڑی کو ملیس ہوٹل سے ملا دے گی۔

اپنی طرز کا ایک انوکھا

اور نرالا ناول

رسیلی

شہزاد تبسم خوشباش (ایم اے)

دیگر کتب

عشقِ رائیگاں	(ناول)	احسن شکوہ
ماورا	(ناول)	ناصر اسرار
گفتگوئے اہلِ ادب		عشرت ممتاز
تکلف بر طرف		عشرت ممتاز
شبِ غم		شکیل بدایونی
ممتاز پکوان		محمودہ ممتاز